عمیرہ احمد

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایئر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔

1۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ ہجے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور وہاں کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ گئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

گیارہویں قسط

حاصل و محصول

نیویارک میں واقع امریکہ کے سب سے بڑے میڈیا ڈسٹرکٹ مڈ ٹاؤن مین ہٹن کے کولمبس سرکل میں واقع ٹائم وارنر سینٹر کی عمارت کے سامنے کھڑے پیٹرس ایباکا کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے چمک رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر میں اس عمارت کے اندر واقع سی این این کے اسٹوڈیوز میں امریکہ کے ممتاز ترین اخباری صحافیوں میں سے ایک اینڈرسن کوویر سے اس کے پروگرام 360 کے سلسلے میں ملاقات کرنے والا تھا۔

اینڈرسن کوویر دو ہفتے بعد کانگو میں بارانی جنگلات کے حوالے سے ایک پروگرام کرنے جا رہا تھا۔ اس نے انگلینڈ اور یورپ کے اخبارات میں پیٹرس ایباکا کے انٹرویوز اور پگمیز کی بقا کے لیے چلائی جانے والی اس کی مہم کے بارے میں بنیادی معلومات لینے کے بعد اپنی ٹیم کے ایک فرد کے ذریعے اس سے رابطہ کیا تھا۔ اور آج اسے کوویر کے ساتھ ایک خفیہ ملاقات کرنی تھی اور پیٹرس ایباکا خوشی سے بے قابو تھا۔ کانگو کے تاریک جنگلات میں بسنے والے پگمیز کی جدوجہد کی کہانی کبھی روشنیوں سے چمکتی تہذیب یافتہ دنیا کے اس جنگل میں سنی جا سکتی تھی، ایباکا کو اس کی توقع تھی پر یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اتنی جلدی بھی ہو سکتا تھا۔ وہ واشنگٹن میں کئی دنوں سے کئی نیوز چینلز کے لوگوں سے ملتا رہا تھا اور امید و ناامیدی کے درمیان لڑھکتا پھر رہا تھا اور ان ہی نیوز چینلز پر مختلف حوالہ جات کے ذریعے رابطہ کرتے کرتے اسے بغیر کسی حوالے کے اور اچانک ـــــ اینڈرسن کوویر کی طرف سے ملنے والی وہ کال غیر یقینی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نعمت غیر مترقبہ بھی تھی۔

کئی سالوں سے کی جانے والی اس کی وہ بے نام جدوجہد اگر سی این این پر کوویر کے پروگرام میں ہائی لائٹ ہوتی اور دنیا کے سامنے آتی تو اس کے بعد ایباکا کے لیے بہت ساری چیزیں آسان ہو جاتیں۔ اور اس کے لیے سب کچھ جتنا آسان ہو جاتا۔ ورلڈ بینک اور اس سے منسلک عالمی قوتوں کے لیے اس پروجیکٹ کو دنیا کی نظروں سے چھپائے اسی طرح چلائے جاتے رہنا اتنا ہی مشکل ہو جاتا۔ بین الاقوامی میڈیا کی کوریج اور اس کوریج کے نتیجے میں ہونے والی تنقید کا سامنا کرنا مشکل ہوتا، پروجیکٹ ختم ہونے کے خدشات تو جو پیدا ہوتے سو ہوتے لیکن ورلڈ بینک کے لیے افریقہ سے دوسرے ممالک میں اسی طرح کے نئے پروجیکٹس کے ٹھیکے اور آغاز مشکل سے مشکل ہو جاتا۔ وہ بوتا جسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بوتل میں بند رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے اور اس میں کامیاب بھی تھے۔ یک دم جن بن گیا تھا اور کسی جن کو بوتل میں واپس قید کرنے سے زیادہ آسان اس کی جان لے لینا تھا۔

ایباکا کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اینڈرسن کوویر کی طرف سے ملنے والی اس کال نے اس کی زندگی اور موت کے حوالے سے بھی فیصلہ کر دیا تھا۔ مگر تاخیر بس تھوڑی سی ہوئی تھی اس کی نگرانی کرنے والے لوگوں سے۔ ایک سراسیمگی اور بدحواسی پھیلی تھی ان لوگوں میں جنہوں نے یہ طے کرنا تھا کہ اب اچانک سی این این کے منظر میں آجانے کے بعد وہ فوری طور پر ایباکا کا کیا کریں۔ تشویش اس بات پر بھی ہوتی تھی کہ اگر ایباکا اور پگمیز کے حوالے سے کوویر نے پروگرام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو چوٹی کے اور کتنے ایسے صحافی تھے جو اس پروجیکٹ کے حوالے سے پروگرام کرنے کی تیاریوں میں تھے۔

ایباکا جن چھوٹے موٹے نیوز چینلز اور جرنلسٹس کو "بڑا" اور "طاقتور" سمجھ کر واشنگٹن میں ان کے ساتھ گھنٹوں گزار کر آتا رہا تھا۔ وہ سب پہلے ہی ایباکا کی نگرانی کرنے والے لوگوں کی فہرست میں شامل تھے۔ ان سے ایباکا کے حوالے سے پہلے ہی بات کر لی گئی تھی اور انہیں اس پروجیکٹ اور اس ایشو کی کوریج کے حوالے سے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی ہدایات بھی پہنچائی گئی تھیں کہ امریکی مفادات کے لیے اس پروجیکٹ کے حوالے سے کوئی منفی خبر کوریج اور رپورٹ کس قدر نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ اور ان چھوٹے چینلز اور نیوز جرنلسٹس کو تابع کرنا

آسان تھا۔ سی این این جیسے بڑے ادارے کو بھی امریکن مفادات کو ہر چیز پر بالاتر رکھنا کی سوچ کے تابع رکھنا مشکل نہیں تھا مگر مشکل تھا تو ان نیوز جرنلسٹس کی عالمی مقبولیت اور پہنچ پر کنٹرول رکھنا جو سی این این پر جب بھی کسی ایشو کو کتنا بھی امریکی مفادات کو بالاتر رکھنے کی پالیسی کے باوجود اٹھاتے وہ دنیا میں کسی نہ کسی نئے تنازعے کو جنم دے دیتے.....

اور یہاں بھی ایباکا کو مانیٹر کرنے والے لوگوں کو اچانک درپیش آنے والا چیلنج یہی تھا۔ اگر وہ پروگرام کووپر ایباکا سے پہلے پیش کرنے کا ارادہ نہ کر چکا ہوتا تو سی آئی اے کے لیے کووپر کو اس آفشنسی صحافت سے روکنے کا واحد حل یہ تھا کہ ایباکا کو اس تک کسی بھی قیمت پر نہ پہنچنے دیا جاتا لیکن یہاں کووپر۔ ایباکا سے اس اسٹیج پر رابطہ کر رہا تھا جب مباوہ اور اس کی ٹیم پہلے ہی اس ایشو پر بہت زیادہ کام کرنے کے بعد کانگو روانگی کی تیاریوں میں تھی اور اب اس صورت حال میں کیا جاتا۔! یہ تھا وہ چیلنج جس نے فوری طور پر ایباکا اور کووپر کی ملاقات کے حوالے سے سی آئی اے کو پریشان کیا تھا اور اس پریشانی میں اضافہ تب ہو گیا تھا جب ایباکا اس کال کے ملنے کے فوراً" بعد ہی واشنگٹن سے نیویارک کے لیے چل پڑا تھا اور جب تک ان کا اگلا لائحہ عمل فائنل ہو سکا ایباکا ٹائم وارنر سینٹر پہنچ چکا تھا۔

اینڈرسن کووپر کے ساتھ دو گھنٹے کی ایک گرماگرم نشست کے بعد وہ جب سی این این اسٹوڈیوز سے باہر نکلا تھا تو ایباکا کا جوش پہلے سے بھی زیادہ بڑھ چکا تھا۔

اسے پہلی بار سالار سے رابطے کا خیال آیا تھا کیونکہ اینڈرسن کووپر کے ساتھ سوال و جواب کے اس آف کیمرہ سیشن میں سالار سکندر کا ذکر کئی بار آیا تھا۔ اس نے کئی بار اس کے لیے تعریفی جملے ادا کیے تھے.... کیسے سالار سکندر نے اس پروجیکٹ کے حوالے سے اس کے تحفظات کو سنجیدگی سے سنا۔ کیسے وہ چھ ماہ اس کے ساتھ ان جنگلات میں جا جا کر مقامی لوگوں کے ساتھ حقائق اکٹھا کرتا رہا.... اور کیسے اس نے ورلڈ بینک کو جمع کیے جانے والے حقائق اور تحفظات پر مشتمل رپورٹ بھیجی تھی جو اس پروجیکٹ کے اختیارات کو ہی نہیں اس کی بنیاد کو بھی قابل اعتراض گردانتی تھی! سالار سکندر کے لیے اپنے ستائشی جذبات کووپر تک پہنچاتے ہوئے ایباکا کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ اس نے سالار سکندر کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

کووپر اس پروجیکٹ کے حوالے سے جن مزید لوگوں سے بات چیت کرنے والا تھا ان میں سالار سکندر کا نام سرفہرست تھا.... سی آئی اے کو اس کا اندازہ تھا.... یہ وہ دن تھا جب سالار سکندر سفر کرتے ہوئے رات کو واشنگٹن پہنچ رہا تھا اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ بدقسمتی اس سے پہلے اس کے انتظار میں وہاں بیٹھی تھی۔

ایباکا نے اس عمارت سے نکلنے کے بعد سینٹرل پارک کی طرف جاتے ہوئے بے حد خوشی کے عالم میں سالار کو ٹیکسٹ کیا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اب سی این این تک رسائی حاصل کر چکا تھا اور کووپر ہی کے حوالے سے اسے واشنگٹن کے سی این این اسٹوڈیوز میں اسی کی ٹیم کے چند اور لوگوں سے بھی ملنے کا موقع مل گیا تھا... اور ایباکا ساتویں آسمان پر تھا۔

اسے اب کووپر کے ساتھ دو ہفتے کے بعد کانگو واپس جانا تھا جہاں وہ اینڈرسن کووپر کو اس پروجیکٹ کے حوالے سے کی جانے والی تحقیقات میں مدد دیتا اور وہ خواب جو کئی سالوں سے صرف خواب تھا پیٹرس ایباکا اسے بالآخر حقیقت بنتا دیکھنے لگا تھا۔ اس ٹیکسٹ میں ایباکا نے اسے بتایا تھا کہ وہ بے حد خوش تھا.... بے حد.... پیٹرس ایباکا چھوٹے موٹے نیوز چینلز اور اخبارات میں اس مسئلے کو لے کر پھرتا اور بولتا رہا تھا اور خوار ہوتا رہا تھا....

اینڈرسن کووپر سی این این پر پرائم ٹائم میں امریکہ کے مقبول ترین پروگرامز میں سے ایک 360 میں جب اسی مسئلے پر بات کرتا تو صرف عالمی افق پر ہی تہلکہ نہیں مچتا بلکہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور ورلڈ بینک کے اندر بھگدڑ

مچنے کے ساتھ ساتھ ان دوسری عالمی طاقتوں کے لیے بھی پریشانی کے آثار پیدا ہوتے جو اس پروجیکٹ میں حصہ دار تھے اور جن کے ہاتھ ان پگمیز کے خون سے رنگے جا رہے تھے۔

وہ ٹیکسٹ بہت لمبا تھا۔ اس میں اور بھی بہت کچھ تھا۔۔۔ اور پیٹرس کا جوش و خروش وہیں ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس بہت لمبے ٹیکسٹ کو کرتے کرتے ای میل کر دیا تھا۔ سالار سکندر اس وقت اپنی فلائٹ پر تھا اور کچھ گھنٹوں کے بعد وہ جب واشنگٹن اترا تھا تب تک اس کے رابطوں کے تمام ذرائع زیر نگرانی آچکے تھے۔ پیٹرس ایباکا کی وہ آخری ای میل سالار سکندر کو اس کی موت کے بعد ملی تھی۔ لیکن ان لوگوں کو سالار سکندر کے جہاز اترنے سے بھی کئی گھنٹے پہلے مل گئی تھی جو پیٹرس ایباکا کی زندگی اور موت کے حوالے سے فیصلہ کر رہے تھے۔

ایباکا کی فوری موت انہیں نہیں چاہیے تھی۔ انہیں فی الحال کچھ گھنٹوں کے لیے اس کی زندگی چاہیے تھی۔ اپنی تحویل میں ایباکا کو رکھتے ہوئے وہ اب ایباکا ہی کے ذریعے اس پورے کیس کو بند کرنا چاہتے تھے۔ وہ پنڈورا باکس جسے ایباکا نے کھولا تھا' وہ ایباکا کے ہاتھوں ہی بند کروانا چاہتے تھے۔۔۔ اور اس کے بعد وہ ایباکا سے جان چھڑا لیتے۔۔۔ اس کی طبعی موت کے ذریعے۔

بعض اوقات کسی شخص کی زندگی کسی دوسرے کی موت بن جاتی ہے۔۔۔ اور کسی دوسرے کی موت کسی اور کی زندگی۔۔۔ ایباکا کی موت کے فیصلے نے سی آئی اے کی فوری طور پر سالار سکندر کو مار دینے کی حکمت عملی بدل دی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے سالار سکندر کو بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں ہونے والے مذاکرات کے بعد اس کے انکار اور معاملہ حل نہ کرنے کی صورت میں ایک "حادثاتی موت" کا سامنا کرنا تھا۔ اینڈرسن کوپر سے ایباکا کی ہونے والی اچانک ملاقات نے سی آئی اے کو یک دم پسپا کر دیا تھا۔ وہ ایباکا اور سالار دونوں کو اکٹھا نہیں مار سکتے تھے۔۔۔ شاید مارنے کا سوچ ہی لیتے اگر اتفاقی طور پر وہ دونوں ایک ہی وقت میں امریکہ میں موجود نہ ہوتے اور وہ بھی دو قریبی شہروں میں۔۔۔ وہ ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتے تھے کہ کسی تفتیش شروع ہونے کی صورت میں ایباکا اور سالار کی طبعی اموات کے درمیان کوئی اور قدرتی تعلق نکال لیا جاتا۔

سالار کو فی الحال صرف خوف زدہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور سی آئی اے کو اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے غلط حکمت عملی' غلط آدمی پر لاگو کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پیٹرس ایباکا کو چند گھنٹوں کے بعد بروکلین کے ایک ایسے علاقے کی ایک تنگ و تاریک گلی میں روکا گیا تھا جہاں ایک قریبی عمارت میں ایباکا کو اپنے ایک دوست سے ملنا تھا۔ سی آئی اے کا خیال تھا ایباکا ان کے لیے حلوہ تھا جسے وہ بہت آرام سے اسے پکڑ کر لے آتے۔ ایسا نہیں ہوا تھا۔ ایباکا ان دو افراد سے بڑی بے جگری سے لڑا تھا جنہوں نے اچانک اس کے قریب اپنی گاڑی روک کر اسے ریوالور دکھاتے ہوئے اندر بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ساری زندگی امریکہ کی مہذب دنیا میں مہذب طور طریقوں کے ساتھ گزاری تھی لیکن جنگل اور جنگلی زندگی اس کی سرشت اور جبلت میں تھی' اپنا دفاع کرنا اسے آتا تھا۔

وہ ان تربیت یافتہ گماشتوں کے قابو میں نہیں آیا تھا۔۔۔ پستہ قامت ہونے کے باوجود وہ سخت جان اور مضبوط تھا۔ وہ پٹتا اور پیٹتا رہا تھا۔ اس سڑک سے گزرتے ہوئے اکا دکا لوگوں میں سے کسی نے ایک سیاہ فام اور دو سفید فاموں کے درمیان ہونے والی اس دھینگا مشتی کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گزرنے والے سفید فام تھے اور پیٹرس ایباکا ان کی ملامتی نظروں کا' معاملے کو نہ سمجھتے ہوئے بھی نشانہ تھا۔ جرم ہمیشہ کالا کرتا تھا۔۔۔ قصوروار ہمیشہ کالا ہوتا تھا۔ وہ فلاسفی پاس سے گزر جانے والے لوگوں کے ذہنوں کے ساتھ ساتھ نظروں میں بھی تھی۔

وہ ایسا معاشرہ نہیں تھا جو کسی سیاہ فام کو پٹتے دیکھ کر انسانیت کے جذبے کے تحت تڑپ جاتا اور مدد کے لیے بن بلائے آجاتا۔۔۔ اور یہاں تو ایک ایسا سیاہ فام تھا جو پٹ رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ پیٹ بھی رہا تھا۔ خود لہولہان تھا تو ان

دو سفید فاموں کو بھی لہولہان کر چکا تھا۔ پتا نہیں یہ ایبا کا کی بد قسمتی تھی۔ ان دونوں ایجنٹس کی یا پھر سی آئی اے کی ...... کہ لڑتے لڑتے ریوالور ایبا کا کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور ایک بار ریوالور ہاتھ میں آنے پر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ان دونوں افراد پر گولیاں چلادی تھیں۔ گولی ایک کو لگی تھی لیکن دوسرا خود پر ہونے والے فائر سے، بہت پہلے اپنا ریوالور نکال کر ایبا کا پر دو فائر کر چکا تھا جو اس کے سینے میں لگے تھے۔

یکے بعد دیگرے ہونے والے ان تین فائرز نے اس سڑک پر چلتے راہ گیر کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کردیا تھا اور ان ہی میں سے کسی نے پولیس کو بھی فون کیا تھا لیکن پولیس کے آنے سے پہلے ہی وہ دونوں ایجنٹ شدید زخمی حالت میں تڑپتے ایبا کا کو گاڑی میں ڈال کر فرار ہو گئے تھے۔ جس ایجنٹ کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ وہ ہوش و حواس میں تھا اور اپنی گاڑی میں ایبا کا کو لے کر فرار ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے سرپرستوں کو سارے واقعے سے انفارم کردیا تھا۔

ایبا کا کی وہ حالت اس دن سی آئی اے کے لیے دوسرا جھٹکا تھی۔ انہیں ایبا کا صحیح سلامت کچھ گھنٹوں کے لیے چاہیے تھا تاکہ اس کے ذریعے ان تمام چیزوں کو بھی نابود کر سکتے جو ایبا کا کی موت کی صورت میں کسی اور کے ہاتھ لگ جانے کی صورت میں ان کے لیے کوئی اور پنڈورا باکس کھڑا کرویتا۔ سی آئی اے کو یہ پتا تھا کہ ایبا کا کے پاس موجود کاغذات کی ہزاروں نہیں تو کم از کم سینکڑوں کاپیاں تھیں، جو ایبا کا مختلف لوگوں کے پاس رکھواتا آ رہا تھا۔ پتا نہیں یہ احتیاط تھی یا کوئی خوف یا کوئی حکمت عملی، لیکن یہ وہ واحد حفاظتی تدبیر تھی جو ایبا کا کے ذہن میں ابھرنے والے خدشات کا ایک حل تھا اور یہ خدشات اس وقت ابھرنا شروع ہوئے تھے جب ایک سال پہلے پہلی بار کچھ لوگوں نے اس سے رابطہ کر کے اس پورے معاملے سے پیچھے ہٹ جانے کے عوض رشوت دینے کی کوشش کی تھی۔ رشوت شاید ایک بہت چھوٹا اور گھٹیا لفظ تھا اس سب کے لیے جو اسے آفر کیا گیا تھا۔ اگر بلینک چیک کسی کو صرف روپے کے لیے پیش کیا جاتا تھا تو ایبا کا کو اس مقصد سے پیچھے ہٹنے اور دوسرے لفظوں میں اپنے لوگوں کی زندگی بیچ دینے کے عوض ہر چیز کے حوالے سے ایک بلینک چیک پیش کیا گیا تھا... کوئی بھی ایسی چیز جو ایبا کا کی خواہش ہوتی... کوئی بھی چھوٹی سے چھوٹی، بڑی سے بڑی...

ایبا کا کا انکار 'اقرار' میں نہیں بدلا تھا۔ قیمت ہمیشہ اقرار کی ہوتی ہے "انکار انمول" ہوتا ہے... بکنے والے آدمیوں کے بیچ میں نہ بکنے والا آدمی کانٹے کی طرح چبھتے ہوئے بھی ہیرے کی طرح چمکتا ہے اور سی آئی اے "ہیروں کے کاروبار" میں مہارت رکھنے کا دعوا رکھتی تھی۔

ان پیش کشوں اور اس انکار کے بعد ایبا کا کو پہلی بار یہ خدشات لاحق ہونے لگے تھے کہ اگر اسے خریدا نہیں جا سکا تو پھر اسے مارا جا سکتا ہے... اور یہ خدشہ ہی وہ چیز تھی جس نے ایبا کا کو اپنے بہت سے دوستوں اور ساتھیوں کے پاس ان دستاویزات کی کاپیاں رکھوانے پر مجبور کرنا شروع کردیا تھا۔ سی آئی اے کو اس کی بھی خبر تھی۔ ایبا کا نے اگر سینکڑوں کاپیاں امریکہ اور کانگو اور انگلینڈ میں اپنے دوستوں کے پاس رکھوائی تھیں تو سی آئی اے کو ان سینکڑوں لوگوں کی مکمل معلومات تھیں... وہ دستاویزات ہر اس جگہ سے چوری کر کے ان کی جگہ کچھ اور ڈاکومنٹس رکھ دی جاتی تھیں اور ایبا کا کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوا تھا کہ اس کے پیچھے اس پروجیکٹ کے حوالے سے سارے سراغ مٹائے جاتے رہے تھے۔

فی الحال دنیا میں اب صرف دو شخص تھے جن کے پاس وہ دستاویزات اصلی شکل میں تھیں، کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر... پیٹرس ایبا کا اور سالار سکندر... پیٹرس ایبا کا اب موت اور زندگی کی کشمکش میں تھا اور سالار سکندر اگلے دن خوار ہونے والا تھا مگر سی آئی اے کے لیے فی الحال سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ وہ ایبا کا کے دستخط کیسے حاصل کرتے، جن کی انہیں فوری ضرورت تھی تاکہ وہ اس کے وہ لاکرز کھلوا سکتے جہاں اس کی اصل دستاویزات تھیں... ان کی

حکمت عملی یہ تھی کہ وہ ان اصلی دستاویزات کو حاصل کرنے کے بعد ایباکا کو ختم کردیتے۔ مگر سب کچھ اس کے الٹ ہوا تھا۔

پلان اے اور پلان بی ناکام ہو چکا تھا۔ اب سی آئی اے کو پلان سی سے کام لینا تھا لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایباکا کے پاس ایک پلان ڈی تھا جس کا انہیں کبھی پتا نہیں چل سکا تھا۔۔۔ وہ کانگو میں اپنی ایک گرل فرینڈ کے پاس ایک وصیت چھوڑ کر آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

امامہ کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ کتنی دیر بے ہوشی کی حالت میں رہی تھی یا رکھی گئی تھی مگر بے ہوشی جب ختم ہونا شروع ہوئی تھی تو اس نے جیسے بے اختیاری کے عالم میں سب سے پہلے اس وجود کو ڈھونڈنا شروع کیا تھا جسے اس نے پہلی اور آخری بار آپریشن تھیٹر میں بے ہوش ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔ تکلیف کی حالت میں بھی اسے یاد تھا کسی نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک لڑکا تھا۔

درد سے بے حال اس نے محمد حمین سکندر کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اسے چوما تھا اور پھر اسے چومتی چلی گئی تھی۔ وہ بے حد کمزور تھا اس کی بڑی دو اولادوں کے برعکس بے حد کمزور۔۔۔ اور وجہ اس کی قبل از وقت پیدائش تھی۔ وہ تین ہفتے قبل دنیا میں آیا تھا۔۔۔ نیم غنودگی میں وہ اپنا بستر ٹٹولتی رہی۔

اس بات کا احساس کیے بغیر کہ وہ نوزائیدہ بچہ اس کے بستر پر نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر اسے بے مقصد تلاش کرتے رہنے کے بعد اسے اچانک یاد آ گیا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہو سکتا تھا۔ بے ہوشی کی دوا کا اثر آہستہ آہستہ زائل ہونا شروع ہو رہا تھا۔ اس کی یادداشت جیسے آہستہ آہستہ واپس آرہی تھی۔۔۔ دماغ نے کام کرنا شروع کیا تھا تو آہستہ آہستہ اسے سب یاد آنے لگے تھے۔۔۔ جبریل۔۔۔ عنایہ۔۔۔ سالار۔ وہ کچھ بے چین ہوئی تھی' جبریل اور عنایہ کہاں تھے؟ پیڈی کہاں تھی؟ اور سالار' کیا اس کو پتا تھا اس کی اس حالت کے بارے میں۔

اس نے بھاری سر اور آنکھوں کے ساتھ اس کمرے کا جائزہ لیا تھا جس میں وہ تھی۔ وہ ایک ہاسپٹل کا وی آئی پی روم تھا اور ایک ساؤنڈ پروف کمرہ' جس کی کھڑکیوں کے سامنے بلائنڈز تھے اور امامہ اس ذہنی حالت میں فوری طور پر یہ اندازہ نہیں کرپائی تھی کہ وہ دن تھا یا رات اور وقت!۔۔۔ وقت کیا ہو رہا تھا۔۔۔ اس نے وقت کا خیال آنے پر کمرے کی کسی دیوار پر دیوار گیر تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہاں کوئی وال کلاک نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا' وہ آپریشن کے بعد اس کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے سلائی گئی تھی اور اب وہ ہوش میں آئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ دو دن کے بعد ہوش میں آرہی تھی۔ امامہ نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ وہاں کیسے آئی تھی۔ ذہن پر زور دے دے کر۔

☼ ☼ ☼

سی آئی اے کے لیے سب سے بڑی پریشانی سالار کی فیملی تھی۔ انہیں غائب کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا مگر انہیں یہ احساس دلائے بغیر غائب کرنا کہ انہیں غائب کیا جارہا تھا سب سے مشکل کام تھا۔ بینک کے کرتا دھرتاؤں کو ابھی سالار سے مذاکرات کرنے تھے اور ان مذاکرات کے نتیجے میں اگر وہ مان جاتا تو پھر اپنی فیملی کے ساتھ ہونے والے کسی برے سلوک پر وہ رد عمل کا اظہار کر سکتا تھا۔۔۔ وہ اسے یہ سراغ نہیں دینا چاہتے تھے کہ ورلڈ بینک کے علاوہ کوئی دوسری طاقت اس سب میں ملوث تھی۔

سالار جس رات واشنگٹن کے لیے روانہ ہوا تھا اس کے اگلے دن امامہ کی گائنا کولوجسٹ نے اسے فون کیا تھا۔ امامہ کے معائنے کی تاریخ تین دن بعد کی تھی۔ اس کی امریکن ڈاکٹر نے اسے اسی دن ایمرجنسی میں آنے کے لیے

کہا کیونکہ اسے کسی میڈیکل کیمپ میں شرکت کے لیے اگلے ایک ہفتہ کے لیے گھانا میں رہنا تھا۔ اس کی سیکریٹری نے امامہ سے کہا تھا کہ وہ اپنی تمام اپائنٹمنٹس ری شیڈول کر رہی ہے اور اس نے امامہ کو آج کے دن کا کہا تھا۔ امامہ نے کسی غور و خوض کے بغیر جانے کی ہامی بھرلی تھی۔ وہ اسے ایک معمول کی بات سمجھ رہی تھی اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا اگر سالار سکندر سی آئی اے کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا تو امامہ تو کوئی شے ہی نہیں تھی۔

وہ ہمیشہ کی طرح جبریل اور عنایہ کے ساتھ بیڈی کو بھی ہسپتال لے کر گئی تھی۔ وہ کنشاسا کے بہترین اسپتالوں میں سے ایک تھا کیونکہ وہاں پر زیادہ تر غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنیز اور سفارت کاروں کا علاج ہوتا تھا سالار اس وقت اپنی فلائٹ پر تھا اور امامہ کا خیال تھا وہ جب تک واشنگٹن پہنچتا وہ اس سے بہت پہلے واپس گھر آجاتی۔ لیکن وہ واپس گھر نہیں آسکی تھی۔

اس کی ڈاکٹر نے اس کا الٹراساؤنڈ کرنے کے بعد کچھ تشویش کے عالم میں اس سے کہا تھا کہ اسے بچے کی حرکت ابنارمل محسوس ہو رہی ہے۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ اسے کچھ اور ٹیسٹ کروانے ہوں گے اور ساتھ اسے کچھ انجکشن بھی لینا ہوں گے۔ امامہ کو تشویش ہوئی تھی تو صرف یہ کہ سالار وہاں نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے ہمیشہ اس کے ساتھ ہی وہاں آئی تھی۔ ایسے معائنوں کے لیے، لیکن اسے اپنے بچے کے حوالے سے کوئی فکر نہیں تھی، کیونکہ وہ بچے کی حرکت کی ابنارملٹی کو بھی ایک اتفاقی چیز سمجھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے فوری طور پر ہاسپٹل میں کچھ گھنٹوں کے لیے یہ کہہ کر ایڈمٹ کیا تھا کہ انہیں اس کو زیر نگرانی رکھنا تھا۔

اسے ایک کمرے میں شفٹ کیا گیا تھا اور جو انجکشن امامہ کو دیے گئے تھے وہ درد بڑھانے والے انجکشن تھے۔ امامہ کو گھر سے غائب اور سالار اور اپنی کسی اور فیملی ممبر سے رابطہ منقطع رکھنے کے لیے سی آئی اے کے پاس اس سے بہترین حل نہیں تھا کہ اس کے بچے کی قبل از وقت پیدائش عمل میں لائی جائے۔

اس کے بچے کی حالت اتنی اچھی تھی کہ وہ تین ہفتے پہلے پیدا ہونے پر بھی زندہ بچ سکتا تھا۔ اور نہ بچتا تو بھی سالار یا امامہ میں سے کوئی ورلڈ بینک یا سی آئی اے کا ہاتھ اس ساری صورت حال میں سے برآمد نہیں کر سکتا تھا۔

امامہ انجکشن لگوانے سے پہلے ہاسپٹل کے کمرے میں ہی بیڈی، جبریل اور عنایہ کو لے آئی تھی اس وقت بھی اس کا یہی خیال تھا کہ چند گھنٹوں میں وہ واپس گھر چلی جائے گی لیکن اسے پہلی بار تشویش تب ہوئی تھی جب اسے دردِ زہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور ڈاکٹر نے اس کی تصدیق بھی کر دی تھی کہ انجکشن کے ری ایکشن میں شاید انہیں بچے کی زندگی بچانے کے لیے فوری طور پر دنیا میں لانا پڑے۔

وہ پہلا موقع تھا جب امامہ بری طرح پریشان ہوئی تھی وہاں کنشاسا میں گھر کے چند ملازموں کے علاوہ ان کا کوئی ایسا حلقہ احباب نہیں تھا جنہیں وہ ایسے کسی بحران میں مدد کے لیے پکارتے یا جن پر بھروسا کرتے۔ ان کا جتنا میل ملاپ تھا وہ سرکاری تھا اور غیر ملکی تھا۔

فوری طور پر امامہ کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا تھا کہ وہ بچوں کو کہاں بھیجے۔ اس کی ڈاکٹر نے اسے مدد کی پیش کش کی تھی کہ وہ بچوں کو اپنے گھر رکھ سکتی ہے، لیکن امامہ کے لیے تو یہ ناممکن تھا۔ وہ اپنی اولاد کے بارے میں جنون کی حد تک محتاط تھی اور خاص طور پر جبریل کے حوالے سے۔ یہ غیر فطری نہیں تھا۔ اس نے ایک بھرے پرے خاندان سے نکل کر دس سال کی قید تنہائی کاٹی تھی اور پھر امید اور ناامیدی کے درمیان لٹکتے ہوئے اس نے ان خونی رشتوں کو پایا تھا۔ وہ اس کی کل کائنات تھے اور اسے اس وقت ملے تھے جب وسیم کی موت کے بعد وہ مایوسی کے سب سے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔ جبریل اس کی زندگی میں اس وقت بہار کی طرح آیا تھا۔ اس کے وجود کے اندر پلتے ہوئے بھی اس نے ماں کو کسی مسیحا کی طرح سنبھالا تھا۔

وہ پہلی بار جبریل کو دیکھنے اور گود میں لینے پر بلک بلک کر رو دی تھی۔ لگتا تھا اولاد نہیں معجزہ تھا اس کے لیے... اور یقین یہ نہیں آ رہا تھا کہ یہ معجزہ اس کے لیے کیسے ہو گیا تھا۔

وہ اس کی وہ اولاد تھی جس نے اس کی زندگی کے بدترین دنوں میں سے کچھ دن اس کے وجود کے اندر پلتے ہوئے اس کے کرب کو سہتے ہوئے گزارے تھے اور یہ وہ احساس تھا جو امامہ کو جبریل کے سامنے ہمیشہ شرمندہ بھی رکھتا تھا اور احسان مند بھی۔ سالار کہتا تھا وہ جبریل کی عاشق تھی اور وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اسے جبریل کے سامنے واقعی کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ عنایہ... سالار دونوں کہیں پیچھے چلے جاتے تھے... وہ اس پر بھروسا کرتی تھی اور چار سال کے اپنے اس بیٹے کو ہر جگہ اپنے ساتھ یوں رکھتی تھی جیسے وہ بہت بڑا ہو۔ جبریل عام بچوں جیسی عادات نہیں رکھتا تھا۔ ذہانت اسے باپ سے ورثے میں ملی تھی لیکن برداشت اس نے کہاں سے لی تھی؟ یہ امامہ نہیں جان پائی تھی۔ اس کے دونوں بچے ہی ضدی اور شرارتی نہیں تھے لیکن جبریل میں ایک عجیب سی سنجیدگی اور سمجھ داری تھی جو اس کے معصوم چہرے پر بلا کی بجتی تھی۔

وہ ہر چیز کا بے حد خاموشی سے مشاہدہ کرنے کا عادی تھا، بنا کوئی تبصرہ کیے۔ امامہ کون سی چیز کہاں رکھ کر بھولتی تھی یہ جبریل کو یاد رہتا تھا۔ وہ سالار سکندر کی عدم موجودگی میں اس گھر کا ''بڑا'' تھا... اور وہ جیسے اپنے اس کردار سے بخوبی واقف بھی تھا۔

ہسپتال میں امامہ اور ڈاکٹر کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو بھی اس کے سامنے ہی ہوتی رہی تھی اور وہ چپ چاپ بیٹھا سن اور دیکھ رہا تھا۔

امامہ کو اب بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کی ڈلیوری کم از کم تب تک ٹل جائے جب تک سالار امریکہ پہنچ جائے اور وہ اس سے بات کر لے اور اسے صورت حال سے آگاہ کر دے... وہ اس کے اور بچوں کی فوری دیکھ بھال کے لیے تو کچھ کر ہی نہ سکتا لیکن کم از کم وہ اس سے ڈلیوری سے پہلے ایک بار بات تو کر لیتی۔

وہ خوف جو ہمیشہ اسے اپنے حصار میں لیتا رہا تھا وہ اب بھی لے رہا تھا... اور کیا ہوا... اگر ڈلیوری کے دوران مر جائے تو... اور یہ وہ ''تو'' تھی جو اسے ہر بار آپریشن تھیٹر میں جاتے ہوئے سالار سے ایک بار معافی مانگنے پر مجبور کرتی تھی۔ اپنی احسان مندی جتانے پر بھی مجبور کرتی تھی لیکن بس زبان اگر ایک جملے پر آ کر اٹکی تھی تو وہ اس سے محبت کا اظہار تھا... وہ آج بھی سالار سے محبت کے اظہار کے لیے بس جملے اور لفظ ہی ڈھونڈتی رہ جاتی تھی۔ وہ لفظ اور وہ جملے جو اسے اتنے خالص، اتنے سچے لگتے کہ وہ سالار تک وہ جذبات پہنچا پاتی جو اس کے دل میں اپنے مرد کے لیے تھے۔ اللہ کے بعد جو بھی تھا اسی کے دم سے تھا۔ وہ حمین کی پیدائش سے پہلے موت کے خوف میں مبتلا ہوئی تھی... اور اس بار پہلے سے کئی گنا زیادہ کیونکہ سالار دور تھا... وہ تنہا تھی... اور اس کے بچے کم سن تھے۔

اس کی خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ درد بڑھ رہا تھا اور ڈاکٹر اسے آپریشن تھیٹر میں لے جانا چاہتی تھی کیونکہ کیس نارمل نہیں تھا۔ اسے آپریشن کرنا تھا۔

امامہ نے بیڈی کو اپنے بچوں کی ذمہ داری سونپنے سے پہلے جبریل کو عنایہ کی ذمہ داری سونپی تھی۔ اسے بہن کا خیال رکھنے کا کہا تھا اور کبھی بھی اسے اکیلا نہ چھوڑنے کا کہا تھا۔ جبریل نے ہمیشہ کی طرح سر ہلایا تھا۔ فرماں برداری سے۔ یہ ذمہ داری اسے پہلی بار نہیں سونپی گئی تھی، ہمیشہ سونپی جاتی تھی... لان میں اکیلے کھیلتے ہوئے... کسی شاپنگ مال میں شاپنگ کے دوران، پرام میں بیٹھے... گاڑی میں اکیلے بیٹھے جب سالار کبھی کسی سروس اسٹیشن یا کسی اور جگہ اکیلا انہیں لے کر جاتا اور کچھ منٹوں کے لیے اتر کر کچھ لینے جاتا، جبریل خود بخود کمانڈ سنبھالنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا... اور عنایہ بھائی کی فرماں برداری کرتی رہتی تھی... ایک بار پھر جبریل کو ایک ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ ایک بار پھر اس نے ہمیشہ کی طرح ماں کو تسلی دی تھی۔

"آپ نیا بے بی لے آئیں۔ میں اس بے بی کا خیال رکھوں گا۔"
چار سالہ جبریل نے انگلش میں ماں کو تسلی دی تھی اور اس کی تسلی امامہ کے ہونٹوں پر اس تکلیف میں بھی مسکراہٹ لے آئی تھی۔ آپریشن تھیٹر میں جانے سے پہلے اس نے ان دونوں کو گلے لگا کر چوما تھا اور پھر بیڈی کو ان کا خیال رکھنے کا کہہ کر اور سالار کو اطلاع دینے کا کہتے ہوئے اپنا فون اور بیگ تھمائی تھی۔
اور اب جب وہ ہوش میں آئی تھی تو اس کمرے میں وہ اکیلی تھی۔ وہاں نہ بیڈی تھی نہ جبریل.... نہ عنایہ.... نہ ہی حمین....

☼ ☼ ☼

یوٹیوب پر کسی نے ایک ویڈیو اپ لوڈ کی تھی۔ جس میں ایک سیاہ فام بروکلین کے ایک نسبتاً "پس ماندہ حصے میں ایک پاس سے گزرنے والی گاڑی سے یک دم نکلنے والے دو سفید فام لوگوں سے لڑتا نظر آیا تھا... ان سفید فاموں کے ہاتھوں میں موجود ریوالور سے بچنے کی کوشش کرتا انہیں چھینتا اور ان پر فائر کرنے کے بعد ان میں سے ایک کے ہاتھوں گولی کھا کر... گرتا نظر آیا تھا۔ پھر ان دونوں افراد کا اسے بے رحمی سے گھسیٹ کر گاڑی میں تقریباً" پھینکنے والے انداز میں گرایا جانا بھی اس ویڈیو میں تھا۔
ویڈیو سیل فون سے نہیں اس بلڈنگ میں رہنے والے ایک سیاہ فام نوعمر بچے نے ہینڈی کیم سے بنائی تھی جو اتفاقاً "اس جگہ سے بالکل قریب ایک بلڈنگ کی دوسری منزل کی کھڑکی سے ایک اسکول پروجیکٹ کے سلسلے کی ایک ویڈیو شوٹ کر رہا تھا "میرے پڑوسی"... اس نے اپنی گلی میں شروع ہونے والی اس لڑائی کو اتفاقاً "لیکن بڑی دلچسپی سے یہ سوچتے اور کمنٹری کرتے ہوئے ریکارڈ کیا تھا کہ وہ اس علاقے میں ہونے والی اسٹریٹ فائٹ کو بھی اپنے اطراف کے ایک امتیازی فیچر کے طور پر پیش کرے گا... لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اسٹریٹ فائٹ گولیوں کے تبادلے پر نہیں گولیاں مارنے پر ختم ہوگی۔
سی آئی اے کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ویڈیو بہت قریب سے بنی تھی اور اس میں نظر آنے والے تینوں افراد کے چہرے واضح تھے... سی آئی اے کی بے وقوفی یہ تھی کہ انہوں نے ایک سیاہ فام ٹارگٹ کو اٹھوانے کے لیے دو سفید فاموں کا انتخاب کیا اور انہیں ٹارگٹ کو اٹھوانے کے لیے اس جگہ بھیجا جہاں سیاہ فاموں کی آبادی نسبتاً زیادہ تھی۔
یہ ان ایجنٹس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ وہاں سے ایک سیاہ فام کو پیٹ کر اور گولی مار کر بھی نہ صرف خود صحیح سلامت آگئے تھے بلکہ اس سیاہ فام کو بھی لے گئے تھے۔
اس بچے نے ویڈیو شوٹ کرتے ہوئے بھی چلا چلا کر ان دونوں افراد کو سیاہ فام کو کھینچ کر گاڑی میں ڈالنے سے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کوشش میں ناکامی کے بعد اس نے اس گاڑی کی نمبر پلیٹ کو زوم کر کے ریکارڈ کیا تھا۔
پولیس کو ویڈیو دینے سے پہلے اس نے وہ ویڈیو سیاہ فاموں کے ساتھ امریکہ میں ہونے والی زیادتیوں پر مبنی ایک ویب سائٹ پر منتقل کی تھی اور اس ویب سائٹ نے اسے یوٹیوب پر... اگلے بارہ گھنٹوں وہ ویڈیو یوٹیوب پر دستیاب ہوگئی تھی... اس پر بے شمار لوگوں نے رد عمل کا اظہار کیا تھا اور ہزاروں ملامتی تبصرے اور سفید فاموں کے لیے گالیاں... وہ بارہ گھنٹوں میں یوٹیوب سے نیوز چینلز پر آگئی اور وہاں سے بین الاقوامی نیٹ ورکس پر....
پیٹرس ایباکا کو پہچاننا مشکل نہیں تھا وہ بہت جلد پہچانا گیا تھا۔ پولیس اس جگہ سے قریبی ہسپتال میں بھی پہنچ گئی تھی جہاں وہ ایجنٹس ایباکا کی زندگی بچانے کے لیے فوری طبی امداد دلانے گئے تھے اور ہاسپٹل کی انتظامیہ کو یہ بھی پتا تھا کہ وہ ایک اسپیشل مریض تھا جسے سی آئی اے کے دو ایجنٹس لے کر آئے تھے اور اس کی حالت کچھ بہتر ہونے

پر سرجری کے فوراً" بعد وہاں سے لے گئے تھے۔
NYPD نے سی آئی اے سے رابطہ کیا تھا اور انہیں یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ایبا کا کو فوری طور پر واشنگٹن منتقل کر دیا گیا تھا اور وہ وہاں مر چکا تھا۔ سی آئی اے اب سرپیٹ رہی تھی کہ وہ میڈیا پر پیٹرس ایبا کا کے ایک حادثے میں زخمی ہو کر ہاسپٹل جانے والی خبر کو کیسے درست ثابت کرتی۔
پیٹرس ایبا کا کے ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہونے کی خبر میڈیا پر چلانا ان کی ایسی حکمت عملی تھی جو اب ان کے گلے کی ہڈی بن گئی تھی۔ طوفان یوٹیوب پر کیا مچا تھا' طوفان تو وہ تھا جو سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں آیا تھا۔ ایک آسان ترین سمجھا جانے والا آپریشن سی آئی اے کے منہ پر ذلت اور بدنامی تھوپنے والا تھا۔ ساتھ امریکن گورنمنٹ اور ورلڈ بینک بھی پھنسنے والے تھے اور فی الحال سی این این کو اس مصیبت سے نجات تو ایک طرف اس پر قابو پانے کا بھی کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
کبھی کبھی انسان کو اس کی بے وقوفی نہیں اس کی ضرورت سے زیادہ چالاکی لے ڈوبتی ہے۔ سی آئی اے کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ایک تیر سے دو شکار کرتے کرتے وہ اپنی کمان ہی تڑوا بیٹھے تھے۔ انہوں نے پیٹرس کو نیویارک کے اسی ہاسپٹل میں چھوڑ دیا ہوتا تو ان کی بچت ہو جاتی۔ وہ دو افراد کسی گینگ کے ثابت کر دیے جاتے یا کوئی مجرم' جو ایبا کا کو لوٹنے کے لیے اس سے الجھے تھے۔ کچھ دن شور مچتا پھر بات کالے اور گورے کی روایتی لڑائی تک ہی محدود رہ کر نسلی تعصب کے خلاف کچھ اپیلوں' قراردادوں اور شمعیں روشن کرنے کے ساتھ ختم ہو جاتی... پیٹرس ایبا کا بھی ختم ہو جاتا اور اس کے ساتھ اس کا مشن بھی۔۔۔ عزت سی آئی اے کی بھی بچی رہتی اور ناک ورلڈ بینک کی بھی۔۔۔ لیکن اس آپریشن کے ماسٹر مائنڈ کو ہر چیز کو الجھا کر انجام تک پہنچانے کی خواہش تھی کہ کل کوئی اس گتھی کو سلجھانے کے لیے دھاگے کا سرا ڈھونڈتا ہی رہ جاتا لیکن مسئلہ یہ ہوا تھا کہ گتھی الجھانے والے اسے الجھاتے الجھاتے خود اندر پھنس گئے تھے اور اب انہیں باہر نکلنا نہیں آ رہا تھا۔
وہ اسے کسی حادثے کا زخمی دکھا کر اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے اور یہ کام وہ واشنگٹن میں کرنا چاہتے تھے' جہاں سالار سکندر تھا اور اس دن واشنگٹن میں صرف ایک حادثہ ہوا تھا۔ جس کا ایک زخمی پیٹرس ایبا کا کو ظاہر کر کے دونوں کا تبادلہ کیا گیا تھا۔ ہاسپٹل کی انتظامیہ کو ایبا کا کے حوالے سے معلومات تھیں بالکل نیویارک کے اس ہاسپٹل کی طرح جہاں ایبا کا کو پہلی بار لے جایا گیا تھا۔
اس کی حالت مسلسل بگڑ رہی تھی اور سی آئی اے سرجری کے بعد ہاسپٹل سے اسے اپنے ٹھکانے پر لے جا کر بھی اس سے کوئی کام کی بات نہیں پوچھ سکی تھی۔ تو اب انہیں اس سے وہ آخری کام لینا تھا جس کے لیے اسے واشنگٹن "پہنچایا" گیا تھا اور جس کے لیے نیوز چینلز پر بار بار اس حادثے کے زخمیوں اور مرنے والے کے نہ صرف نام چلائے گئے تھے بلکہ ان کی پاسپورٹ سائز کی تصویریں بھی سی آئی اے کو یقین تھا نیوز چینلز پر چلنے والی یہ خبر سالار سکندر کے علم میں ضرور آئے گی اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ جس طرح کی قربت ان دونوں کی حالیہ کچھ عرصے میں رہی تھی' وہ متقاضی تھی کہ سالار اس سے ملنے ضرور جاتا۔
اندازے درست ثابت ہوئے تھے۔ وہ خبر سالار نے دیکھ بھی لی تھی اور وہ فوری طور پر اس سے ملنے بھی چلا گیا تھا۔ اگر کسی طرح وہ خبر اس کے علم میں نہ آتی یا وہ اس سے ملنے نہ جاتا تب سی آئی اے والے ہاسپٹل کے ذریعے اس سے رابطہ کرتے اور کہتے کہ پیٹرس ایبا کا کی آخری خواہش ہے کہ وہ سالار سکندر سے ملنا چاہتا ہے۔ لیکن انہیں پلان B کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ سالار' ایبا کا کو دیکھنے چلا گیا تھا اور ہاسپٹل میں آنے جانے میں اسے تقریباً" دو گھنٹے لگے تھے اور سی آئی اے کو اتنا ہی وقت چاہیے تھا۔ اس کے کمرے سے لیپ ٹاپ سمیت ہر اس چیز کا صفایا کرنے کے لیے جسے وہ کام کی سمجھتے تھے سالار کو کسی اور کام کے لیے کمرے سے اتنی دیر تک باہر رکھنا ان

کے لیے مشکل تھا کہ وہ اپنا لیپ ٹاپ تو ساتھ رکھتا تھا۔ لیکن ہاسپٹل جاتے ہوئے انہیں توقع تھی وہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر جائے گا۔

سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا جیسے ان کا پلان تھا لیکن نتیجہ وہ نہیں نکلا تھا جس کی انہیں توقع تھی۔

وہ ویڈیو انہیں لے ڈوبی تھی۔ کوئی بھی اس ویڈیو میں نظر آنے والے چہرے کے نقوش کو بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ اتنے واضح تھے اور اس ویڈیو میں دوسری سب سے نمایاں چیز وہ وقت اور تاریخ تھی جو اسکرین پر نیچے آرہی تھی۔ وہ اس پیٹرس ایباکا کی شناخت نہیں بدل سکتے تھے اور وہ واشنگٹن کے ہاسپٹل میں بظاہر حادثے میں زخمی ہو کر آنے اور مرنے والے ایباکا کی شناخت بھی نہیں بدل سکتے تھے۔ وہ نیوز چینلز پر ایباکا کی تصویریں نہ چلوا چکے ہوتے اس حادثے کے فوراً" بعد شدید زخمی فرد کے طور پر... تو شاید سی آئی اے یہی کرتی اور ایباکا کو واشنگٹن کے اس ہاسپٹل سے فوری طور پر واپس نیویارک منتقل کر دیا جاتا لیکن وہ ایک غلطی کے بعد صرف دوسری نہیں' تیسری اور چوتھی غلطی بھی کر بیٹھے تھے۔

اس جلتی آگ کو بجھانے کی کوششیں بہت جلد شروع کر دی گئی تھیں۔ انہوں نے یوٹیوب سے اس ویڈیو کو ہٹانے کی کوششیں شروع کر دیں' وہ اسے بلاک نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ شور شرابے کو بڑھاتا لیکن وہ بار بار اپ لوڈ ہونے والے لنکس کو مٹا رہے تھے اور اس میں کوشش کے باوجود ناکام ہو رہے تھے۔ سی آئی اے کی بلاگر ٹیم مختلف لنکس پر آنے والے تبصروں میں سیاہ فام بن کر ایسی پوسٹ کر رہے تھے جو یہ ظاہر کرتا کہ یہ کوئی نسلی تعصب ہو سکتا ہے۔ پیٹرس ایباکا کو مارنے میں کم از کم سی آئی اے یا ایف بی آئی جیسی کوئی ایجنسی ملوث نہیں ہو سکتی تھی' وہ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان کرنے پر تیار تھے مگر یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ وہ معاملہ قومی سطح کا نہیں رہا تھا۔ وہ آگ امریکا سے کانگو تک پہنچ گئی تھی۔

اینڈرسن کوپر کی ٹیم نے پیٹرس ایباکا کی مشکوک حالت میں موت کے بعد ان پیغامات اور ای میلز کو اور اس ویڈیو میں نظر آنے والے وقت کو چیک کیا تھا۔ وہ سب پیغامات اور ای میلز جن میں ایباکا نے کوپر کے شو میں شرکت سے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ کسی قسم کی معاونت سے بھی انکار کیا تھا وہ اس ویڈیو کے دو گھنٹے بعد کے میسج تھے اور اس وقت کے جب نیویارک کے ہاسپٹل میں ایباکا کی سرجری ہو رہی تھی اور ایسے پیغامات صرف کوپر ہی کو نہیں ان دوسرے پروگرامز کے میزبانوں کو بھی کیے گئے تھے یا صحافیوں کو جن سے ایباکا پچھلے کچھ دنوں سے مل رہا تھا اور پگمیز کے مسئلے کو سامنے لانے کی درخواست کر رہا تھا۔

اینڈرسن کوپر نے ایک نیوز پروگرام میں پیٹرس کے ان پیغامات اور اس ویڈیو کی ٹائمنگ کو پوائنٹ آؤٹ کیا تھا اور پھر اس نے نیویارک اور واشنگٹن کے دو ہاسپٹلز کے معتبر ذرائع کا حوالہ دیتے ہوئے یہ راز کھول دیا تھا کہ ان دونوں ہاسپٹلز میں اسے داخل کرنے والے سی آئی اے سے تعلق رکھتے تھے۔

پیٹرس ایباکا کی موت کی وجہ کیا ہو سکتی تھی... کون اسے مار سکتا تھا اور کیوں مار سکتا تھا۔ اس کو صرف وہ شخص بتا سکتا تھا جس کا نام ایباکا کوپر کے سامنے کئی بار لے چکا تھا... جو واشنگٹن میں اس سے ملنے کے لیے آنے والا واحد ملاقاتی تھا... اور جس نے اپنی شناخت ایباکا کے رشتہ دار کے طور پر ظاہر کی تھی... امریکہ کے ہر نیوز چینل پر اس رات سالار سکندر کا نام اس حوالے سے چل رہا تھا اور ہر کوئی سالار سے رابطہ کرنے میں ناکام تھا۔

☆ ☆ ☆

اور اس رات اپنے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ان تمام نیوز چینلز کی کوریج ماؤف دماغ کے ساتھ سالار بھی دیکھ رہا تھا... سی آئی اے بھی دیکھ رہی تھی... اور ورلڈ بینک کے وہ سارے کرتا دھرتا بھی جو دو دن سے سالار

سکندر کو ہراساں کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔
پیٹرس ایباکا کو اس ویڈیو میں نشانہ بنتے دیکھ کر سالار کو اس رات یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کی فیملی زندہ نہیں تھی۔ وہ لوگ اگر ایباکا کو مار سکتے تھے اور اس طرح مار سکتے تھے تو وہ اور اس کی فیملی کیا شے تھی اور اگر اس رات اسے کسی چیز میں دلچسپی تھی تو وہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی زندگی تھی... اور کچھ نہیں... اپنا آپ بھی نہیں...

اور سی آئی اے میں اس آپریشن کو کرنے والے لوگ اس رات صرف ایک بات سوچ رہے تھے... انہیں سالار سکندر کا کیا کرنا تھا... ؟ زندہ رکھنا تھا... مار دینا تھا...؛ زندہ رکھنا تھا تو پھر اس کی کھلنے والی وہ زبان کیسے بند رکھتے جو ورلڈ بینک سمیت بہت سے دارالحکومتوں میں بھونچال برپا کر دیتی... مار دیتے تو کیسے مارتے... کہ اس کی موت پیٹرس ایباکا کی طرح سی آئی اے کے منہ پر ایک اور بدنامی کے دھبے کا اضافہ کرتی۔ یا پھر وہ کنشاسا میں موجود اس کی بیوی اور بچوں کی زندگی کے ذریعے اسے بلیک میل کرتے... قید میں وہ اسے رکھ نہیں سکتے تھے۔ ہمیشہ کے لیے وہ اس کے رابطوں کے ذرائع بھی بند نہیں کر سکتے تھے۔ زندگی یا موت؟... زندگی؟ موت؟ ٹیبل ٹینس کی گیند کی طرح ہاں یا نہیں کے کورٹس میں گھوم رہی تھی زندگی۔
پھر فیصلہ ہو گیا تھا لیکن وہ سی آئی اے نے نہیں کیا تھا۔ کانگو کے عوام نے کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

چار سالہ جبریل نے اپنے خاندان کو درپیش آنے والے اس بحران میں جو رول ادا کیا تھا' وہ اس نے زندگی میں کئی بار ادا کرنا تھا۔ یہ اس تھے سے بچے کو تب علم نہیں تھا۔ اسے پتا تھا اس کی ماں تکلیف میں تھی' اسے یہ بھی پتا تھا کہ اس کی ماں ایک بے بی لینے جا رہی تھی جو ایک لڑکا تھا اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ اس کی ماں نے ہمیشہ کی طرح دو سالہ عنایہ کی ذمہ داری اس کو سونپی تھی۔
امامہ کے جانے کے بعد پیڈی کو اچانک خیال آیا تھا کہ امامہ اسے گھر سے کچھ چیزیں لانے کا کہہ کر گئی تھی جو نوزائیدہ بچے اور اس کے لیے ایک بیگ میں گھر پر پہلے ہی پیک کر کے رکھی ہوئی تھیں اور پیڈی سے ان دونوں بچوں کے لیے کھانے پینے اور ان کے کپڑوں کے لیے بھی کہہ کر گئی تھی کیونکہ اسے بچوں کو گھر واپس نہیں بھیجنا تھا جب تک سالار نہ آجاتا۔ اس نے پیڈی سے کہا تھا وہ ان بچوں کو ہاسپٹل میں ہی کسی فی میل اٹینڈنٹ کے پاس چھوڑ کر گھر سے یہ چیزیں لے آئے یا پھر گھر میں موجود کسی اور ملازم کی مدد لے لیکن وہ بچوں کو کہیں نہیں لے جائے گی۔
پیڈی کو امامہ کی یہ ہدایات یاد نہیں رہی تھیں۔ ان کا گھر وہاں سے صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا اور پیڈی نے سوچا تھا۔ وہ یہاں ان بچوں کو اکیلا چھوڑنے کے بجائے ان کو اپنے ساتھ ہی لے جائے گی اور واپس لے آئے گی۔
جبریل نے ساتھ لے جانے کی اس کوشش کے جواب میں صاف انکار کرتے ہوئے اسے یاد دلایا تھا کہ ممی نے اس سے کہا تھا وہ وہیں رہیں گے۔ وہ انہیں ساتھ نہیں لے جائے گی۔ پیڈی کو یاد آگیا تھا اور اس نے دوبارہ اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ جبریل کو بہت اچھی طرح جانتی تھی... چار سال کی عمر میں بھی وہ بچہ کسی طوطے کی طرح ماں باپ کی باتیں رٹ کر پھر وہی کرتا تھا اور مجال تھی کہ وہ کسی دوسرے کی باتوں میں آکر امامہ یا سالار کی طرف سے ملنے والی ہدایات فراموش کر دیتا۔ پیڈی انہیں امامہ کی ڈاکٹر کی ایک اسسٹنٹ کے پاس چھوڑ کر فوری طور پر گھر چلی گئی تھی۔
اس کی عدم موجودگی میں عنایہ کو نیند آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر کی اسسٹنٹ نے نیند میں جھولتی ہوئی دو سال کی اس بچی کو اٹھا کر ایک بینچ پر لٹانے کی کوشش کی اور جبریل نے اسے روک دیا۔ وہ وہاں سے عنایہ سمیت ہٹنا نہیں چاہتا تھا جہاں پیڈی اسے بٹھا کر گئی تھی اور جہاں اسسٹنٹ عنایہ کو لے کر جا کر لٹانا چاہتی تھی۔ وہ ایک بغلی کمرہ تھا...
چار سال کا وہ بچہ اپنی دو سالہ بہن کے ساتھ وہیں بیٹھے رہنا چاہتا تھا کیونکہ اسے پتا تھا کسی اجنبی کے

ساتھ نہیں نہیں جانا چاہیے۔ کسی ایسی جگہ جو دور ہوتی.... اسسٹنٹ کچھ حیران ہو کر واپس اپنی ٹیبل پر گئی تھی۔ وہ ایک انٹرسٹنگ بچہ تھا۔ اس نے اپنی کرسی پر بیٹھے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔ دو سالہ عنایہ اب جبریل کی گود میں سر رکھے سو رہی تھی اور وہ بے حد چوکنا بیٹھا بہن کے سر کو اپنے ننھے ننھے بازوؤں کے حلقے میں لیے ملاقاتی کمرے میں آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور تب وہ عورت ان دونوں کے برابر میں آکر بیٹھی اور اس نے جبریل کو ایک مسکراہٹ دیتے ہوئے اس کا سر تھپتھپایا اور جواباً" اس بچے کے تاثرات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے یہ بے تکلفی اچھی نہیں لگی ہے۔ اس عورت نے دوسری بار سوئی ہوئی عنایہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے کی کوشش کی تو اس بار جبریل نے اس کا ہاتھ بڑی نرمی سے پرے کرتے ہوئے سرگوشی میں اس سے کہا۔

"She is sleeping (یہ سو رہی ہے)"

"اوہ سوری!" امریکن عورت بظاہر شرمندگی ظاہر کرتے ہوئے اسے دیکھ کر مسکرائی، جبریل نے ایک بار پھر سپاٹ چہرے اور اس کی طرف دیکھے بغیر اس کی مسکراہٹ نظر انداز کی۔

اس عورت نے اپنا پرس کھول کر اس کے اندر سے چاکلیٹ کی ایک بار نکال کر جبریل کی طرف بڑھائی۔

"نو تھینکس" جواب چاکلیٹ آگے بڑھائے جانے سے بھی پہلے آگیا تھا۔

"میرے پاس کچھ کھلونے ہیں۔" اس بار اس عورت نے زمین پر رکھے ایک بیگ سے ایک اسٹفڈ کھلونا نکال کر جبریل کی طرف بڑھایا اس کی سرد مہری کی دیوار توڑنے کی یہ اگلی کوشش تھی۔ جبریل نے اس کھلونے پر ایک نظر ڈالے بغیر بہت شائستگی سے اس سے کہا۔

"Would you please stop bothering us"

(آپ ہمیں تنگ کرنا بند کریں گی پلیز)

ایک لمحہ کے لیے وہ عورت چپ ہی رہ گئی تھی یہ جیسے شٹ اپ کال تھی اس کے لیے مگر وہ وہاں منہ بند کرنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ انہیں ان دونوں بچوں کو وہاں سے لے جانا تھا اور ان کا خیال تھا۔ آتے جاتے ملاقاتیوں میں دو کم سن بچوں کو بہلا پھسلا کر وہاں سے لے جانا کیا مشکل تھا۔ زور زبردستی وہ اتنے لوگوں کے سامنے عنایہ کے ساتھ کر سکتے تھے جبریل کے ساتھ نہیں۔

وہ اب منتظر تھی کہ عنایہ کی طرح وہ چار سالہ بچہ بھی تھک کر سو جائے پھر شاید ان کو کسی طرح وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ لیکن اسے جبریل کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ بیٹھے رہنے کے بعد وہاں سے اٹھ گئی تھی اسے ان بچوں کے حوالے سے نئی ہدایات لینی تھیں اور پانچ منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو پیڈی وہاں ان دونوں کے پاس موجود تھی۔

وہ عورت ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی تھی۔ وہ ان دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے، صرف اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتے تھے جب تک امریکہ میں سالار کے ساتھ معاملات طے نہ ہو جاتے۔

امریکہ میں سالار کو اس کی فیملی کے حوالے سے صاف جواب دینے کے باوجود سی آئی اے اس کی فیملی پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ وہ عورت ایک بار پھر اس وزیٹرز روم میں کہیں اور بیٹھ گئی تھی۔ عنایہ اب جاگ گئی تھی اور باتھ روم جانا چاہتی تھی۔ پیڈی اسے باتھ روم لے کر جانا چاہتی تھی۔ اس نے جبریل کو ایک بار پھر وہیں ٹھہرنے کا کہا تھا۔ وہ نہیں ٹھہرا تھا۔ وہ کسی طرح بھی عنایہ کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کرنے پر تیار نہیں تھا۔ پیڈی کو اسے بھی باتھ روم لے جانا پڑا تھا۔ وہ عورت بھی اٹھ کر ان کے پیچھے باتھ روم آئی تھی اور جبریل نے اس عورت کو ایک بار پھر نوٹس کیا تھا۔

"Why are yor stalking us"

(تم ہمارے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہو۔)

واش بیسن میں ہاتھ دھونے میں مصروف وہ عورت قریبی بیسن میں ہاتھ دھوتی پیڈی کے ساتھ کھڑے اس بچے کا جملہ سن کر جیسے ایڑیوں پر گھومی تھی۔ نہ بھی گھومتی تو بھی اسے اندازہ تھا۔ وہ بچہ اسے ہی مخاطب کر رہا تھا۔ پیڈی نے اس عورت کو دیکھا اور معذرت خواہانہ انداز سے مسکرائی یوں جیسے وہ جبریل کے اس تبصرے سے متفق نہیں تھی۔ لیکن جبریل اسی ناخوش گوار انداز میں اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ پینتالیس سال کی اس عورت نے مسکراتے ہوئے اس چار سال کے بچے کو سراہا تھا۔ وہ پہلی بار ایک چار سال کے بچے کے ہاتھوں پسپا ہوئی تھی اور وہ اسے سراہے بغیر نہیں رہ سکی تھی وہ جن بھی ماں باپ کی اولاد تھا۔ کمال تربیت ہوئی تھی اس کی۔

پیڈی ان دونوں کو لے کر وہاں سے چلی گئی تھی لیکن وہ عورت نہیں گئی تھی وہ ایک بار پھر اس بچے سے وہ جملہ نہیں سننا چاہتی تھی جو اس نے کچھ دیر پہلے سنا تھا۔ بہتر تھا اسے بھیجنے والے اس کی جگہ کسی اور کو بھیج دیتے۔

پیڈی امامہ سے ڈیڑھ گھنٹے بعد بھی نہیں مل سکی تھی کیونکہ ڈاکٹر نے کہا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ آپریشن ٹھیک ہوا تھا لیکن اسے ابھی خواب آور دوا میں دی جا رہی تھیں۔ پیڈی نے امامہ کے فون سے بار بار سالار کو کال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام ہونے کے بعد اسے اپنے نمبر سے بھی کال کی تھی۔ وہ اسے اس کے بیٹے کی خوش خبری دینا چاہتی تھی اور ساتھ یہ اطلاع بھی کہ اس کے دونوں بچے اس کے پاس تھے اور محفوظ تھے لیکن وہ رابطہ نہیں کر پائی تھی۔

پیڈی نے بار بار امامہ سے بھی ملنے کی کوشش کی تھی اور اس کے بچوں کو بھی امامہ سے ملوانے کے لیے ڈاکٹر سے اصرار کیا تھا کیونکہ عنایہ اب بے قرار ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے ان کو بیٹر میں پڑا ہوا حمین تو دکھا دیا تھا لیکن امامہ تک رسائی نہیں دی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اسے دونوں بچوں کو اس کی تحویل میں دینے کا کہا تھا اور ہمیشہ کی طرح جبریل اڑ گیا تھا۔ نیند سے بوجھل آنکھوں اور تھکاوٹ کے باوجود وہ عنایہ کا ہاتھ پکڑے بیٹھا ہوا تھا کیونکہ ممی نے اسے عنایہ کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ اس نے انکوبیٹر میں وہ بے بی بوائے بھی دیکھ لیا تھا جسے ممی لینے گئی تھیں لیکن ممی کہاں تھیں؟ یہ سوال اب صرف اسے ہی نہیں پیڈی کو بھی پریشان کر رہا تھا وہ اب کنشاسا میں سالار کے آفس کے ذریعے اس سے رابطہ کرنے میں مصروف تھی لیکن سالار غائب تھا اور کانگو میں ورلڈ بینک پر قیامت ٹوٹنے والی تھی صرف ورلڈ بینک پر نہیں ان مغربی اقوام کے نمائندوں پر بھی جو کانگو میں استعماریت کے ستون بنے بیٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

پیٹرس ایباکا اپنی موت کے چوبیس گھنٹوں میں ہی صرف کانگو کے پگمیز کا نہیں پورے افریقہ کا ہیرو بن گیا تھا اس خطے نے آج تک صرف بکنے والے حکمران دیکھے تھے جو اربوں ڈالرز کے کمیشن لے کر اپنے ملک کی ہر چیز بیچنے کے لیے ہر وقت تیار بیٹھے تھے اس خطے نے "ہیرو" پہلی بار دیکھا تھا۔ جان دینے والا ہیرو۔ پیٹرس ایباکا ساری زندگی پر امن طریقوں سے جدوجہد کرتا اور اس کا درس دیتا رہا تھا لیکن اپنی موت کے بعد اس کی جو وصیت منظر عام پر آئی تھی' اس میں اس نے پہلی بار اپنی غیر متوقع اور غیر فطری موت کی صورت میں اپنے لوگوں کو لڑنے کے لیے اکسایا تھا اس جنگل کو بچانے کے لیے انہیں سفید فاموں کو مار بھگانا تھا' چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔

اپنی اسی وصیت میں اس نے ورلڈ بینک' امریکہ اور ان دوسری عالمی طاقتوں کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے انہیں ان سب کے خلاف "جہاد" کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ مسلمان نہیں تھا لیکن مذاہب کا تقابلی جائزہ لیتا رہا تھا۔ اور اسے اپنے لوگوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور ظلم کے خلاف بغاوت کے لیے "جہاد" سے زیادہ موزوں

لفظ نہیں ملا تھا۔ اس نے صرف پگمیز کو مخاطب کیا تھا صرف انہیں جنگلوں سے نکل کر شہروں میں آکر لڑنے کے لیے کہا تھا۔ ورلڈ بینک اور ان آرگنائزیشنز کے ہر دفتر پر حملہ کر کے وہاں کام کرنے والوں کو مار بھگانے کا کہا تھا لیکن اس رات وہ صرف پگمیز نہیں تھے جو جوابا کا کی کال پر ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ غیر ملکی آرگنائزیشنز پر چڑھ دوڑے تھے۔ وہ کانگو کے استعماریت کے ہاتھوں سالوں سے استحصال کا شکار ہوتے ہوئے عوام تھے جو باہر نکل آئے تھے۔

کنشاسا میں اس رات کنشاسا کی تاریخ کے وہ سب سے بڑے فسادات ہوئے تھے جن میں کوئی سیاہ فام نہیں صرف سفید فام مارے گئے تھے۔ ورلڈ بینک کے آفسوں پر حملہ کر کے انہیں لوٹنے کے بعد آگ لگادی گئی تھی۔ اور یہ سلسلہ صرف وہیں تک نہیں رکا تھا۔ ورلڈ بینک کے حکام کی رہائش گاہوں پر بھی حملے لوٹ مار اور قتل و غارت ہوئی تھی اور ان میں سالار سکندر کا گھر بھی تھا۔ وہ سالار سکندر کا گھر نہیں تھا جسے آگ لگائی گئی تھی' وہ ورلڈ بینک کے سربراہ کا گھر تھا جسے ہجوم نے اس رات تباہ کیا تھا۔ کانگو میں اس رات ڈیڑھ سو کے قریب امریکیوں اور یورپ کے لوگوں کو مار دیا گیا تھا اور ان میں اکثریت ورلڈ بینک اور دوسری عالمی تنظیموں میں کام کرنے والے افراد اور ان کے خاندان کے افراد کی تھی۔

ورلڈ بینک کے چالیس افراد ان فسادات میں مرے تھے اور یہ چالیس لوگ نچلے عہدوں پر کام کرنے والے لوگ نہیں تھے' وہ ورلڈ بینک کی سینئر اور جونیئر مینجمنٹ تھی۔ اپنی اپنی فیلڈ کے ماہر نامور لوگ۔ جو کئی سالوں سے اس بینک اور اس کے مختلف آپریشنز اور پروجیکٹس سے منسلک تھے اور جو کانگو میں اس ادارے کے ستونوں کے طور پر کانگو کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔

ورلڈ بینک کی تاریخ میں پہلی بار ورلڈ بینک کے خلاف فسادات اور اس کے عملے کا قتل عام کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے دنیا میں ورلڈ بینک کے افسران کو صرف انڈے ٹماٹر مار کر یا ان کے چہروں اور کپڑوں پر سرخ رنگ پھینک کر احتجاج کیا جاتا رہا تھا اور وہ احتجاج کسی اثر اور تبدیلی کے بغیر ختم ہو جاتا تھا۔ وہ مہذب دنیا میں رہنے والوں کا احتجاج تھا۔ یہ اس غیر مہذب دنیا میں رہنے والوں کا احتجاج تھا جنہیں مہذب دنیا انسانوں سے کمتر سمجھ کر رکھتی تھی۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ' ورلڈ بینک اور سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں آپریشن روم کی دیواروں پر لگی اسکرینوں پر تینوں اداروں کے سینئر حکام صرف دم سادھے بے بسی کے ساتھ کانگو کے مختلف علاقوں میں ہونے والے ان فسادات کے مناظر کو دیکھ رہے تھے ان کو بچانے کی کوششیں ہو رہی تھیں لیکن فوری طور پر کوئی بھی کانگو کے ان فسادات میں عملی طور پر نہیں کود سکتا تھا' وہ زیادہ نقصان وہ ہوتا ورلڈ بینک اور دوسرے اداروں کا۔ جو جانی اور مالی نقصان ہوا تھا' وہ پورا کر لیا جاتا لیکن جو ساکھ اور نام ڈوبا تھا' اسے دوبارہ بحال کرنے کے لیے کوئی معجزہ چاہیے تھا۔

ان فسادات کے آغاز سے بالکل پہلے اینڈرسن کوپر نے پیٹرس ایباکا کے ساتھ ہونے والے اس آف کیمرہ سیشن کو اپنے پروگرام میں چلا دیا تھا تب تک اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس رات کانگو میں کیا ہونے والا تھا اگر اسے یا سی آئی اے کو اس کا رتی بھر بھی اندازہ ہوتا تو وہ ٹیپ شدہ چیزیں بھی نہیں چلتیں۔ اس آف کیمرہ سیشن میں پیٹرس ایباکا نے امریکہ اور ورلڈ بینک پر شدید تنقید کرتے ہوئے انہیں گدھ اور ڈاکو قرار دیا تھا۔ جو کانگو کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ اور کوئی ان کا ہاتھ روک نہیں پا رہا تھا۔

پیٹرس ایباکا کا وہ آخری انٹرویو افریقہ میں لوگوں نے اسٹیڈیم اور چوکوں پر روتے ہوئے بڑی اسکرینوں پر سنا تھا اور اس کی گفتگو میں ورلڈ بینک کے صرف ایک عہدے دار کی تعریف تھی جو ورلڈ بینک کو اس پروجیکٹ کی انکوائری پر مجبور کر رہا تھا اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ اس پروجیکٹ اور ورلڈ بینک کو چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ پیٹرس ایباکا نے اس انٹرویو میں پہلی بار اپنی زندگی کو لاحق خطرات کی بھی بات کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ طاقتیں

جو اسے مار ڈالنا چاہتی ہیں وہ سالار سکندر کو بھی مار ڈالیں گی۔

سالار سکندر کا نام پیٹرس ایباکا کے بعد ایک رات میں افریقہ میں زبان زد عام ہو گیا تھا۔ افریقہ میں ویسی شہرت اور ویسا تعارف پہلی بار کسی غیر ملکی کو نصیب ہوا تھا اور وہ "غیر ملکی" اس وقت واشنگٹن میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں ٹی وی پر یہ سب دیکھ رہا تھا پھر بار بار ہوٹل سے باہر جا کر پاکستان فون کر کے اپنی فیملی کے بارے میں پتا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کاش اسے وہ نام وری نہ ملتی' اس نے سوچا تھا۔

اینڈرسن کوپر کا انٹرویو نشر ہونے کے دو گھنٹے کے اندر کانگو میں فسادات شروع ہو چکے تھے اور سالار سکندر نے ان فسادات کے مناظر بھی ٹی وی پر لائیو دیکھے تھے۔ ورلڈ بینک کے دفاتر میں لوٹ مار اور آگ لگانے کے منظر بھی اس فوٹیج کا حصہ تھے اور افسران کے رہائشی علاقوں میں گھروں پر حملے کے مناظر بھی۔ نیوز چینلز یہ بتا رہے تھے کہ کنٹری ہیڈ سمیت سارے گھروں کو لوٹا گیا تھا اور ان بہت سے گھروں میں اموات بھی ہوئی تھیں۔ کچھ میں افسران کی بیویوں پر حملے ہوئے تھے۔ کچھ میں ان کے بچے مارے گئے تھے۔

ٹی وی پر وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے وہ شدید پریشان تھا۔ وہ سب ہو جانے کے باوجود بھی جو ورلڈ بینک کے افسران نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اسے اگر پہلے سے یہ پتا نہ چل چکا ہوتا کہ امامہ اور اس کے بچے گھر پر نہیں تھے تو وہ کبھی بھی اس بیڈ روم میں بیٹھا یہ مناظر نہیں دیکھ پاتا۔ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ کبھی کبھی دشمن کا سب سے بڑا وار آپ کی بقا کا باعث بن جاتا ہے۔ امامہ اور اس کے بچوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ سی آئی اے نے انہیں صرف اس لیے اس گھر سے غائب رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ امامہ سے سالار کی فیملی یا آفس کا بھی کوئی شخص رابطہ نہ کر سکے اور حمین کی تین ہفتے ——— قبل از وقت پیدائش جیسے امامہ اور اس کے بچوں کی زندگی بچنے کا باعث بن گئی تھی پر اس وقت سالار کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔

بے شک اللہ سب سے بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ اور بے شک ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ ہر مشکل کے بعد آسانی تھی۔

☼ ☼ ☼
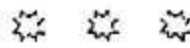
"میرے بچے کہاں ہیں؟" اس نے اٹینڈنٹ کی شکل دیکھتے ہی ہوش و حواس سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"وہ کچھ دیر میں آپ کے پاس آجائیں گے۔۔۔ آپ کو فوری طور پر اس ہاسپٹل سے کہیں منتقل کرنا ہے۔" اٹینڈنٹ نے بے حد مؤدب انداز میں اس سے کہا تھا۔ امامہ نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تھی اور بے اختیار کراہ کر رہ گئی تھی۔۔۔ زخم والی جگہ اب سن نہیں رہی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے کوئی خنجر کسی نے یک دم اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں گھونپا تھا۔ اٹینڈنٹ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے واپس لٹانے میں مدد کی اور اسے لٹانے کے بعد سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی اس ٹرے میں سے ایک انجکشن اٹھا کر سرنج میں بھرنا شروع کیا جو وہ لائی تھی۔

"مجھے کوئی انجکشن نہیں لگوانا' مجھے اپنے بچوں کو دیکھنا ہے۔ امامہ نے بے حد ترشی سے اس سے کہا تھا۔

"یہ آپ کی تکلیف کم کر دے گا۔ آپ کی حالت ابھی ٹھیک نہیں ہے اٹینڈنٹ نے کہتے ہوئے گلوکوز کی بوتل میں سرنج کی سوئی گھونپ دی۔

امامہ نے اپنے ہاتھ کی پشت پر ٹیپ کے ساتھ چپکائی ہوئی سرنج نکال دی۔

"مجھے فی الحال کسی میڈیسن کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنے بچوں سے ملنا ہے اور اپنے شوہر سے بات کرنی ہے۔"

وہ اس بار زخم کی تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھی اور اس نے اٹینڈنٹ کا ہاتھ بھی جھٹک دیا تھا۔ وہ اٹینڈنٹ کچھ دیر چپ کھڑی رہی تھی پھر وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

اس کی واپسی آدھ گھنٹے کے بعد پیڈی، جبریل اور عنایہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلتے ہی ماں پر پہلی نظر پڑتے ہی جبریل اور عنایہ شور مچاتے ہوئے اس کی طرف آئے تھے اور اس کے بستر پر چڑھ کر اس سے لپٹ گئے تھے۔ وہ ڈیڑھ دن کے بعد ماں کو دیکھ رہے تھے۔ پیڈی بھی بے اختیار لپک کر اس کے پاس آئی تھی۔ ڈیڑھ دن سے امامہ کو نہ دیکھنے پر اور ڈاکٹرز کی بار بار کی لیت و لعل پر امامہ کے حوالے سے اس کے ذہن میں عجیب و غریب وہم آ رہے تھے اور اب امامہ کو بخیریت دیکھ کر وہ بھی جذباتی ہوئے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

"تم نے سالار کو اطلاع دی؟" امامہ نے پیڈی کو دیکھتے ہی اس سے پوچھا تھا۔

"میں کل سے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن ان کا نمبر نہیں مل رہا۔ میں نے ان کے آفس اسٹاف سے بھی رابطہ کیا ہے لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ سالار صاحب کے ساتھ ان کا بھی رابطہ نہیں ہو رہا۔"

امامہ کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ پیڈی کا پہلا جملہ تھا جس نے اسے چونکایا تھا۔

"کل؟" وہ بڑبڑائی "آج کیا تاریخ ہے؟"

اس نے پیڈی سے پوچھا اور پیڈی نے جو تاریخ بتائی وہ اس دن کی نہیں تھی جس دن وہ ہاسپٹل میں آئی تھی۔ وہ پچھلی دوپہر کو ہاسپٹل آئی تھی اور اس وقت اگلی رات ہو چکی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا' وہ اتنے لمبے عرصہ تک خواب آور ادویات کے زیر اثر رکھی گئی تھی۔۔۔ اور کل سے سالار نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ امریکہ تو کل ہی پہنچ چکا تھا پھر اس سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے پیڈی سے اپنا بیگ لے کر اس میں سے فون نکال کر اس پر کال کی کوشش کی۔۔۔

اٹینڈنٹ نے اسے بتایا کہ ہاسپٹل میں اس حصے میں سگنلز نہیں آتے تھے۔ وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اپنے سیل فون پر اس نے سب chat apps اور ٹیکسٹ میسجز چیک کر لیے تھے۔ کل سے آج تک اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس وقت سے لے کر جب وہ ہاسپٹل آئی تھی اب تک۔۔۔

بے حد تشویش لاحق ہونے کے باوجود امامہ نے یہی سمجھا تھا کہ ہاسپٹل میں سگنلز کے ایشوز کی وجہ سے وہ کوئی کال یا ٹیکسٹ ریسیو نہیں کر سکی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ پیڈی سے کچھ اور پوچھتی۔ پیڈی نے اسے کانگو میں ہونے والے فسادات کے بارے میں بتایا تھا اور ساتھ یہ بھی کہ کومبے میں ان کے گھر پر بھی حملہ کیا گیا تھا۔ امامہ سکتے میں رہ گئی تھی پیڈی کے پاس تفصیلات نہیں تھیں کیونکہ وہ ایک بار ہاسپٹل سے نکلنے کے بعد دوبارہ بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں گئی تھی۔ اس کے پاس جو بھی خبریں تھیں' وہ اس کے خاندان کے افراد کی طرف سے فون پر ملی تھیں یا پھر ہاسپٹل میں لگے ٹی وی سیٹ پر نشر ہونے والی نیوز سے۔۔۔

یہ وہ لمحہ تھا جب امامہ کو پہلی بار سالار کے حوالے سے بے قراری ہوئی تھی۔۔۔ پیٹرس ایباکا مارا گیا تھا تو سالار کہاں تھا۔۔۔؟ وہ بھی تو واشنگٹن میں تھا۔۔۔ پیڈی نے اسے نیوز چینلز پر چلنے والی ساری خبریں بتائی تھیں۔۔۔ پیٹرس ایباکا کیسے مارا گیا اور کیسے اس کی موت سامنے آئی۔ اس سے آخری بار ملنے کے لیے جانے والا شخص سالار سکندر تھا اور سالار سکندر اس وقت سے غائب تھا۔

امامہ کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔۔۔ اس کا خیال تھا اسے دنیا میں سب سے زیادہ محبت جبریل سے تھی پھر عنایہ سے پھر اپنی اس اولاد سے۔ جس کو ایک دن پہلے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ لیکن اب جب سالار یک دم اس کی زندگی سے کچھ دیر کے لیے عجیب طرح سے غائب ہوا تھا تو اس کے اوسان خطا ہونے لگے تھے۔

وہ جبریل اور عنایہ کو اسی طرح بستر پر چھوڑ کر درد سے بے حال ہوتے ہوئے بھی لڑکھڑاتے قدموں سے فون لیے

کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ اسے ہاسپٹل میں اس جگہ جانا تھا جہاں سے وہ کال کر سکتی اور اس سے بات کر سکتی۔ اسے اس گھر کے تباہ برباد ہونے کا بھی خیال نہیں آیا تھا جس میں ہونے والی لوٹ مار کے بارے میں پیڈی نے اسے کچھ دیر پہلے بتایا تھا۔۔۔ گھر' بچے سب کچھ یک دم اس ایک شخص کے سامنے بے معنی ہو گیا تھا جو اس کا سائبان تھا جو زندگی کی دھوپ میں اس کے لیے تب چھاؤں بنا تھا جب اس کا وجود حدت سے جھلس رہا تھا۔ پاؤں آبلہ پا ہو گئے تھے۔

اٹینڈنٹ اور پیڈی نے اسے روکنے اور پیچھے آنے کی کوشش کی' وہ نہیں رکی۔ اس نے پیڈی کو اپنے پیچھے نہیں آنے دیا اسے بچوں کے پاس رکنے کے لیے کہا۔ وہ ننگے پاؤں پھوڑے کی طرح دکھتے جسم کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے کوریڈور میں نکل آئی تھی۔

سالار وہاں ہوتا تو اس حالت میں اسے بستر سے ہلنے بھی نہ دیتا لیکن سارا مسئلہ یہی تو تھا کہ' سالار وہاں نہیں تھا اور وہ اسے پانے کے لیے بے حال ہو رہی تھی۔ ہاسپٹل میں کوئی ایسی جگہ ڈھونڈتی جہاں سگنل آجاتے جہاں سے وہ سالار سے بات کر پاتی۔ اس کی آواز سن لیتی۔

اس کا جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ یہ موسم نہیں تھا جو اسے لرزا رہا تھا۔ خوف تھا جو رگوں میں خون جما رہا تھا۔۔۔ صرف ہاتھ نہیں تھے جو کپکپا رہے تھے۔۔۔ اس کا پورا جسم پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

"آپ کے شوہر بالکل ٹھیک ہیں۔ میں تھوڑی دیر میں ان سے آپ کی بات کرواتی ہوں۔"

امامہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے چلتے ساکت ہوئی اور اٹینڈنٹ کی آواز پر پلٹی تھی۔ اور پھر وہاں کھڑے کھڑے جیسے موم کی طرح پگھلنے لگی تھی۔۔۔ زرد' کانپتی' ٹھٹھرتی بے آواز روتی۔۔۔ وہ ماں تھی' اپنے بچوں پر جان دے دینے والی۔۔۔ اور وہ رب تھا۔ اپنے بندوں کو ایسے کیسے چھوڑ دیتا' اس نے جس کو پکارا تھا۔ مدد کے لیے وہی آیا تھا۔

رحم اٹینڈنٹ کو اس کی حالت پر نہیں آیا تھا۔ اس برتر ذات کو اپنے بندے پر آیا تھا۔ اور وہ اپنے بندوں پر بلا شبہ بے حد شفقت کرنے والا ہے۔

☆ ☆ ☆

سی آئی اے اور ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکن گورنمنٹ کو ایک ہی وقت میں سالار کی ضرورت پڑی تھی۔ کانگو میں اگر کوئی اس وقت ورلڈ بینک کی عزت کو بحال کرنے کی پوزیشن میں تھا تو وہ سالار سکندر ہی تھا۔ اور پیٹر ایک دم ون مین شو بن گیا تھا۔ افریقہ میں جو آگ پیٹرس ایباکا کی موت نے لگائی تھی وہ سالار سکندر کی زندگی ہی بجھا سکتی تھی۔ فیصلہ تاخیر سے ہوا تھا۔ لیکن فیصلہ ہو گیا تھا۔

اس آپریشن کے تباہ کن نتائج نہ صرف سی آئی اے میں بہت سے لوگوں کی کرسی لے جانے والے تھے بلکہ ورلڈ بینک میں بھی بہت سے سر کٹنے والے تھے۔ تاج کہیں اور رکھا جانے والا تھا۔

سالار سکندر اس سب سے بے خبر ہوٹل کے اس کمرے میں اب بھی نیوز چینلز دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے اپنے باپ سے بات کر کے آیا تھا جنہوں نے اسے بتایا تھا کہ کانگو کے حالات کی وجہ سے فی الحال کانگو کی فلائٹس اور میڈیا دونوں دستیاب نہیں تھے۔ سالار سکندر کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ اس کا وہ غم گسار میگرین ایک بار پھر اس کا غم غلط کرنے آگیا تھا۔ وہ ہوٹل واپس آیا تھا۔ عجیب کیفیت میں ٹی وی کے سامنے کھڑا وہ سالار سکندر سے چلنے والی خبروں' کانگو کے دل دہلا دینے والے مناظر کے ساتھ یوں دیکھتا رہا تھا جیسے وہ کوئی اور تھا نہ اس سالار سکندر سے اس کا کوئی تعلق تھا نہ کانگو سے۔ وہاں امامہ اور اپنی اولاد چھوڑ آنے والا بھی کوئی اور تھا۔ نہیں' جھوں جانے والا بھی کوئی اور تھا۔

"What 'next to exslasy"

"آہ کیا سوال تھا۔ کیا یاد دلایا تھا۔ کیا یاد آیا تھا۔"

" Pain "(درد کا احساس)

" And What is naxt to Pain "

(اور درد کے بعد۔)

اتنے سال بعد ایک بار پھر وہ سوال و جواب اس کے ذہن میں چلنے لگے تھے۔ آخر کتنے موقعے آئے تھے اس کی زندگی میں اسے سمجھانے کہ اس کے بعد کچھ نہیں ہے۔ عدم وجود۔ خالی پن۔

اور وہ اسی عدم وجود کی کیفیت میں کھڑا ہوا تھا ایک بار پھر۔ زمین اور آسمان کے درمیان کسی ایسی جگہ معلق جہاں وہ نہ اوپر جا پا رہا تھا' نہ نیچے آ پا رہا تھا۔

" And What is Naxt to NothingNess "

(اور اس عدم وجود' خالی پن کے بعد۔؟)

اس کا اپنا سوال ایک بار پھر اس کا منہ چڑانے آیا تھا۔

" Hell(جہنم) "

جہنم کوئی اور جگہ تھی کیا۔ اس نے جیسے بے اختیار کراہتے ہوئے سوچا۔

" And What is Next To Hell "

ہاں وہ اس کے بعد والی جگہ جانا چاہتا تھا۔ ان سب تکلیفوں' ان سب اذیتوں' ان سب آزمائشوں سے گزر کر۔ وہاں سے آگے۔ اور آگے۔ آگے جہاں جنت تھی۔ یا شاید اس لمحہ لگی تھی۔

دو دن کے بعد اس کا سیل فون جیسے نیند سے نہیں موت سے جاگا تھا۔ وہ میوزک اور وہ روشنی۔ اسے لگا وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ میوزک اس نے امامہ کی کالر آئی ڈی کے ساتھ محفوظ کیا ہوا تھا۔

If Tomorrow Never Comes

رونان کیٹنگ کے مشہور گانے کی کالر ٹیون۔

سیل فون پر اس کا مسکراتا چہرہ اور اس کا نام۔ سالار کو لگا تھا۔ وہ واقعی جنت میں کہیں تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کال ریسیو کی۔ لیکن ہیلو نہیں کہہ سکا۔ وہ امامہ نے کہا تھا۔ بے قرار آواز میں۔ وہ بول ہی نہیں سکا۔ سانس لے رہا تھا تو بڑی بات تھی۔ اپنے قدموں پر کھڑا تھا تو کمال تھا۔

وہ دوسری طرف سے بے قراری سے اس کا نام پکار رہی تھی۔ بار بار۔ سالار کا پورا وجود کانپنے لگا تھا۔ وہ آواز اسے ہرا کر رہی تھی۔ کسی بنجر سوکھے۔ ٹنڈ منڈ پیڑ پر بارش کے بعد بہار میں پھوٹنے والی سبز کونپلوں کی طرح۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا لیکن اس کے سامنے رو نہیں سکتا تھا۔ وہ مرد تھا۔ بولنا مشکل تھا۔ پر بولنا ضروری تھا۔

"امامہ!" اس نے اپنے حلق میں پھنسے ہوئے نام کو آزاد کیا تھا۔

دوسری طرف وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ وہ عورت تھی۔ یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتی تھی کیونکہ اسے بہادری اور مردانگی کے جھنڈے نہیں گاڑتے ہوتے۔ وہ بے آواز روتا رہا تھا۔ وہ دوزخ سے گزر کر آئے تھے اور کسی نے دوسرے سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ دوسرا کہاں تھا۔ کیوں رو رہا تھا۔

بے آواز روتے ہوئے سالار نے اسی طرح کھڑے کھڑے اس کمرے کے درمیان میں امامہ کی ہچکیاں اور سسکیاں سنتے اپنے جوتے اتارے تھے پھر وہ گھٹنوں کے بل سجدے میں جا گرا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا اللہ کہاں

تھا۔ اور کیسے سنتا تھا۔ اس کی شہ رگ کے پاس۔ اس سے بھی قریب۔

کئی سال پہلے وہ ریڈ لائٹ ایریا میں امامہ کے نہ ہونے پر اسی طرح ایک طوائف کے کوٹھے پر سجدے میں جاگرا تھا۔ آج وہ امامہ کے ہونے پر سجدے میں گرا تھا۔

بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ مشرق۔ مغرب۔ ہر چیز اس کی متاع ہے۔

وہ "کن" کہتا ہے اور چیزیں ہو جاتی ہیں۔

گمان سے آگے۔ بیان سے باہر۔

بے شک اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔

بے شک اللہ ہی سب سے طاقت ور ہے۔

☼ ☼ ☼

"ہی از کیوٹ۔"

جبریل نے حمین پر ایک نظر ڈالنے کے بعد تین لفظوں میں بڑے محتاط اور "مفصل" انداز میں اپنے خاندان میں اس نئے اضافے پر تبصرہ کیا تھا۔ جو فی الحال اسی قسم کے انکوبیٹر میں تھا جس میں اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اس کے برعکس عنایہ بڑے اشتیاق سے والہانہ انداز میں اس "چھوٹے بھائی" کو دیکھ رہی تھی جس کی آمد کے بارے میں وہ مہینوں سے سن رہی تھی اور جسے ایک پری پرستان سے ایک رات ان کے گھر چھوڑ کر جانے والی تھی۔

امامہ کی باتیں سن سن کر اسے چھوٹے بھائی سے زیادہ اس پری کو دیکھنے میں دلچسپی ہوگئی تھی جو ان کے گھر روز یہ دیکھنے آتی تھی کہ انہیں بھائی کی ضرورت تھی یا نہیں۔ وہ امامہ سے بھائی سے زیادہ پری کے بارے میں اشتیاق سے کرید کرید کر پوچھتی تھی۔ جبریل البتہ پاس بیٹھا اپنی اسٹوری بکس کے صفحے الٹتے پلٹتے ان دونوں کی گفتگو سنتا رہتا تھا۔ اس نے کبھی نہ بھائی کے بارے میں سوال کیا تھا نہ پری کے بارے میں۔ کیونکہ اسے پتا تھا "ممی" جھوٹ بول رہی تھیں۔ کیونکہ نہ پریاں ہوتی ہیں اور نہ بھائی کو پری نے لانا تھا۔ بھائی کو اسپتال سے آنا تھا۔ اور اسپتال خود جانا پڑے گا۔ اور وہ بھی کار سے سڑک کے ذریعہ اس اسپتال میں جہاں وہ ممی کے ساتھ جاتے تھے۔ لیکن اس نے اپنی یہ معلومات صرف عنایہ کے ساتھ تنہائی میں شیئر کی تھیں امامہ کے سامنے نہیں۔

"کیا ممی جھوٹ بولتی ہیں؟" عنایہ نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بولتیں لیکن تم چھوٹی ہو اس لیے وہ تم سے یہ کہتی ہیں۔"

اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں بہن کو سمجھایا تھا جس نے بھائی کی فرانے دار زبان اور سوال سن سن کر بہت جلدی بولنا شروع کر دیا تھا۔

وہ سب اس وقت امریکن ایمبیسی کے اندر موجود ایک چھوٹے سے میڈیکل یونٹ میں تھے۔ وہ طوفان جو ان کی زندگی اڑانے آیا تھا۔ کچھ بھی تہس نہس کیے بغیر قریب سے گزر کر چلا گیا تھا۔

امامہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ سالار سے بات چیت کے بعد اب پرسکون تھی۔ اس نے وقفے وقفے سے پاکستان میں سب سے بات کی تھی سب کو اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی اور سب سے حمین کی پیدائش پر مبارک باد وصول کی تھی۔ بچے کی جنس کا پتا چلنے کے بعد وہ کئی مہینے پہلے ہی اس کا نام طے کر چکے تھے۔ حمین کی حالت بہتر تھی۔ وہ کمزور تھا لیکن صحت مند اور ایکٹو تھا۔

اگر اس کی پیدائش قبل از وقت نہ ہوئی ہوتی اور امامہ کی سرجری نہ ہوئی ہوتی تو سالار فوری طور پر ان کو وہاں

سے واشنگٹن بلوانے کی کوشش کرتا۔ لیکن فوری طور پر امامہ اور حمین ایئر ٹریول نہیں کر سکتے تھے اس لیے سالار کانگو آنے والا تھا اور وہ اب اس کے انتظار میں امریکن ایمبیسی میں تھے جہاں بہت سے اور بھی لوگ پناہ لیے ہوئے تھے 'جب تک انہیں کانگو سے نکالنے کے انتظامات نہ ہو جاتے یا حالات پر قابو نہ پالیا جاتا۔ امامہ اور اس کے بچوں کو ہائی پروفائل گیسٹ کا اسٹیٹس ملا ہوا تھا۔ امامہ کو اگر یہ پتا ہوتا کہ اس ہائی پروفائل اسٹیٹس سے پہلے اس کے شوہر پر امریکہ میں کیا گزری تھی تو وہ مر کر بھی امریکن ایمبیسی کی شکل نہ دیکھتی۔

سالار نے اسے ہر بات سے بے خبر رکھا تھا۔ فون پر ان کی بہت لمبی بات نہیں ہو سکی تھی۔ سالار نے اسے آرام کرنے کے لیے کہا تھا۔ اسے خود فوری طور پر ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی۔ اس نے امامہ سے کہا تھا۔ کوئی سگنلز اور سیٹلائٹ کا مسئلہ تھا جس کی وجہ سے اس کا رابطہ اس سے نہیں ہو پا رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ اس قدر پریشان تھا۔

امامہ نے پیٹرس ایباکا کے حوالے سے بات کی تو اس نے اسے تسلی دی کہ سب کچھ ٹھیک ہے 'وہ پریشان نہ ہو۔ اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ اس سلسلے میں پولیس سے بھی رابطے میں ہے۔

امامہ مطمئن ہو گئی تھی۔ اگر سالار کی پریشانی کا باعث صرف اس سے رابطہ نہ پانا تھا تو وہ مسئلہ تو وہ سمجھ سکتی تھی۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ سو نہیں سکی تھی۔ تکلیف میں سکون آور دوائیں لیے بغیر سو نہیں سکتی تھی اور اب وہ دوائیں لے کر سونا نہیں چاہتی تھی۔ پیڈی اب بھی وہیں اس کے پاس تھی اور وہ کمرے میں چلتے ہوئے ٹی وی پر کانگو کے حالات کے حوالے سے چلنے والی خبریں دیکھ رہی تھی۔ مختلف ملکی اور غیر ملکی چینلز کو بدل بدل کر۔ جہاں پیٹرس ایباکا کے حوالے سے ذکر آرہا تھا وہاں سالار سکندر کا ذکر بھی ہو رہا تھا اس انٹرویو کی جھلکیاں بھی بار بار چل رہی تھیں 'جن میں پیٹرس نے بار بار سالار کے بارے میں اچھے الفاظ میں بتایا اور اس کی اور اپنی زندگی کے حوالے سے لاحق خطرات کا ذکر بھی کیا تھا۔

سالار سے بات کرنے کے بعد امامہ کی جو پریشانی ختم ہوئی تھی 'وہ پریشانی ایک بار پھر سر اٹھانے لگی تھی۔ سالار نے اسے ان سب معاملات سے بالکل بے خبر رکھا ہوا تھا۔ وہ پچھلے کئی مہینوں سے کانگو کے جنگلات میں پیٹرس ایباکا کے ساتھ بہت زیادہ سفر کرتا رہا تھا۔ وہ صرف یہ جانتی اور سمجھتی تھی کہ یہ آفیشل کام تھا لیکن ورلڈ بینک کے اس پروجیکٹ کے حوالے سے سالار سکندر کی اختلافی رپورٹ کے بارے میں اسے پہلی بار پتا چلا تھا۔ وہ بھی پیٹرس ایباکا کے اس انٹرویو کے ذریعے۔ معاملات اتنے صاف اور سیدھے نہیں تھے جتنے واشنگٹن میں بیٹھا سالار اسے بتا رہا تھا۔

وہ مصیبت میں تھا لیکن اسے کیوں بے خبر رکھ رہا تھا۔ امامہ کو اس کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ وہاں کنشاسا میں بیٹھ کر اس سے ان سب چیزوں کے بارے میں فون پر سوالات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔

"ممی!" جبریل نے اسے مخاطب کیا 'وہ سوچوں سے چونکی۔

"Who wants to kill Papa "

"پاپا کو کون مارنا چاہتا ہے؟"

وہ اس کے سوال پر منجمد ہو گئی تھی۔

چار سالہ وہ بچہ بے حد تشویش سے اس سے پوچھ رہا تھا۔ امامہ کو ٹی وی دیکھتے ہوئے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھا ٹی وی پر یہ سب کچھ سن اور دیکھ رہا تھا اور اپنے باپ کے حوالے سے ہونے والی ایسی کسی گفتگو کو وہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ بلا کا ذہین تھا اپنے باپ کی طرح۔ امامہ اور سالار اس کے سامنے گفتگو میں بہت محتاط

رہتے تھے۔
امامہ نے ٹی وی آف کر دیا۔ وہ اب اسے ٹالنا چاہتی تھی۔

No one wants to kill papa

(کوئی آپ کے پاپا کو مارنا نہیں چاہتا؟)
اس نے جبریل کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔
"اللہ آپ کے پاپا کی حفاظت کر رہا ہے اور ہم سب کی۔" وہ اسے تھپتھپاتے ہوئے بولی۔
"اللہ نے پیٹرس ایباکا کی حفاظت کیوں نہیں کی؟"
امامہ لاجواب ہو گئی۔ بڑوں کے سوالوں کے جواب آسان ہوتے ہیں' بچوں کے نہیں۔
جبریل کے سوال اسے ہمیشہ ایسے ہی لاجواب کرتے تھے۔ وہ بحث نہیں کرتا تھا۔ بات پوچھتا تھا۔ جواب سنتا تھا۔ سوچتا تھا۔ اور خاموش ہو جاتا تھا۔ مگر امامہ یہ نہیں سمجھ پاتی تھی' اس کے جواب نے اسے قائل کیا تھا یا نہیں۔ وہ بچہ گہرا تھا۔ اس کا احساس اسے تھا۔ وہ بہت حساس تھا۔ وہ اس سے بھی لاعلم نہیں تھی۔ لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے حوالے سے بہت ساری باتیں سوچتا تھا جو وہ ان سے پوچھتا کبھی نہیں تھا۔
"دیکھو' تمہارا چھوٹا بھائی۔ کیسا لگتا ہے تمہیں؟"
امامہ نے اب اس کی توجہ ایک دوسرے موضوع کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔
"ہی از کیوٹ۔"
اس نے جواب دیا تھا حمین کے بغور جائزے کے بعد لیکن اس جواب میں جذباتیت' خوشی اور حیرانی مفقود تھی۔
"تمہارے جیسا لگتا ہے نا؟" امامہ نے اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔
"مجھے تو نہیں لگتا۔"
جبریل نے کچھ اور احتیاط سے بغور اس کا جائزہ لینے کے بعد ماں کو فوراً" جواب دیا تھا۔ اسے شاید ماں کا یہ تبصرہ اور مماثلت اچھی نہیں لگی تھی۔
"اچھا تم سے کیسے ڈفرنٹ ہے؟" امامہ نے دلچسپی سے پوچھا۔
"اس کی مونچھیں ہیں۔ میری تو نہیں ہیں۔"
امامہ بے ساختہ ہنسی۔ وہ حمین کے چہرے اور بالائی لب پر آنے والے روئیں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
عنایہ اب بھی امامہ کے بیڈ کے بالکل قریب پڑے انکوبیٹر کی دیوار سے چپکی کھڑی تھی یوں جیسے حمین چڑیا گھر کا کوئی جانور تھا جسے وہ گلاس وال سے ناک اور ہاتھ ٹکائے ٹواؤ والے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔
"یہ میری طرح لگتا ہے۔" اس نے بہت مدھم آواز میں اٹکتے ہوئے امامہ کو مطلع کیا تھا۔
وہ عنایہ کی مدھم آواز پر ہنس پڑی تھی۔ وہ احتیاط کر رہی تھی کہ سویا ہوا بھائی بیدار نہ ہو جائے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا۔ وہ سویا ہوا بھائی نہیں تھا سویا ہوا جن تھا جو بیدار ہونے کے لیے اپنے باپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔
سالار سکندر اور امامہ ہمیشہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی اولاد دی تھی جو بالکل مشکل نہیں تھی نہ ہی ان دونوں نے انہیں کسی بھی لحاظ سے تنگ کیا تھا۔ ان کے خاندان' دوستوں اور جبریل کے اسکول میں بھی ان دونوں کے بچوں کو مثالی بچے اور انہیں مثالی والدین مانا جاتا تھا۔
کانگو کے فسادات میں پیدا ہونے والا وہ تیسرا بچہ ان کا وہ سکون اور چین چھین کر انہیں واقعی مثالی بنانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ سی آئی اے نے جس بچے کو تین ہفتے پہلے دواؤں کے ذریعے قبل از وقت دنیا میں لانے کی کوشش کی

تھی انہیں اگر محمد حمین سکندر کا تعارف ہو جاتا تو وہ اس پیدائش کو کم از کم تین سو سال تک روکتے۔
مستقبل سے بے خبر امامہ بڑی محبت سے اسے خود سے کچھ فاصلے پر سوئے دیکھ رہی تھی جو دو دن بعد ہی خراٹے لے رہا تھا۔

"کیا یہ خراٹے لیتا ہے؟" یہ جبریل تھا جس نے پہلی بار اس کے خراٹے نوٹس کرتے ہوئے بڑی بے یقینی سے ماں کو دیکھا تھا۔

امامہ اس کے مشاہدے پر حیران ہوئی تھی۔ جبریل کے احساس دلانے پر اس نے پہلی بار غور کیا تھا۔ انکوبیٹر سے اس کے خراٹوں کی آواز نہیں آرہی تھی۔ لیکن اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ بہت نمایاں تھا۔

"نہیں۔ وہ بس گہرے سانس لے رہا ہے۔"

امامہ نے جبریل کا چہرہ بھی حیرانی سے دیکھا تھا۔ اس نے کیسے اندازہ لگایا تھا اس کے سانس لینے کی رفتار سے کہ وہ خراٹے لے رہا ہوگا۔

"ممی! کیا یہ آپ کا لاسٹ بےبی ہے؟" سوال ڈائریکٹ آیا تھا اور بے حد سنجیدگی سے کیا گیا تھا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ ہنسے یا شرمندہ ہو۔ بیڈی ہنس پڑی تھی۔

"ہاں سویٹ ہارٹ! یہ لاسٹ بےبی ہے۔" اس نے جیسے جبریل کو تسلی دی تھی۔

"ہم دو بھائی اور ایک بہن ہے۔" جبریل جیسے مطمئن ہوا اور اس نے انگلیوں کو چھو کر گنا۔

"ہاں ڈیئر۔" امامہ نے اس کا منہ چوم کر اسے یقین دلایا۔ اسے پتا نہیں تھا اس کے گھر ایک اور بچی نے پرورش پانی تھی۔ کنیز غلام فرید عرف چنی۔

سکندر عثمان کے گھر آنے والا وہ مہمان غیر متوقع نہیں تھا' ناقابل یقین تھا۔ وہ ان کے گھر کئی بار گئے تھے۔ ہمسائے کے طور پر... مصالحت کے لیے... تعزیت کے لیے' لیکن ہاشم مبین زندگی میں کبھی ان کے گھر نہیں آئے تھے۔ آج وہ آ گئے تھے تو انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اب ان کے پڑوس میں نہیں رہتے تھے۔ وہ گھر چھوڑ کر جا چکے تھے... اس گھر میں اب کوئی اور رہتا تھا اور گھر بکنے کی خبر پر سالار نے بے حد کوشش کی تھی کہ سامنے آئے بغیر در پردہ کسی اور کو درمیان میں رکھ کر وہ گھر خرید پاتا... وہ ناکام رہا تھا... ہاشم مبین کے بیٹے اب بہت طاقت ور تھے اور ہاشم مبین بہت کمزور ہو چکے تھے... ان کے دل میں فیصلے کی خواہش تھی۔ ہاتھ میں طاقت نہیں تھی جبکہ پراپرٹی ڈیلرز کے ذریعے سالار سکندر ان سے رابطہ کر رہا تھا' وہ کبھی اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ گھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکا تھا' کیونکہ وہ بہت بڑا تھا... آٹھ کنال کا وہ گھر تین حصوں میں بٹ کر بکا تھا اور اس کے باوجود اس پر بچے اور کیسز تھے جو امامہ کی بہنوں نے اپنے حصے کے حوالے سے کیے تھے۔

سکندر عثمان نے سالار کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ اس حق میں نہیں تھے کہ وہ متنازعہ جائیداد خریدی جاتی' خاص طور پر اس لیے کیونکہ وہ امامہ کے والدین کی تھی اور دونوں فیملیز کے درمیان تنازعات تھے' جو سالار کے خود پس پردہ رہ کر سامنے کسی اور کو رکھ کر اس کے ذریعے ایسی کسی خرید و فروخت کے شدید مخالف تھے' خاص طور پر اس لیے بھی کیونکہ سالار کے پاس اتنا بڑا گھر خریدنے کے وسائل نہیں تھے۔ وہ قرضہ اور ادھار لیے بغیر ایسی کوئی خرید و فروخت کر نہیں سکتا تھا اور سکندر عثمان زندگی میں کبھی قرض اور ادھار پر عیاشیاں اور اللے تللے کرنے کے حق میں نہیں رہے تھے۔

اور اب وہ ایک لمبے عرصے کے بعد جس ہاشم مبین کو اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس رعونت' تمکنت کا سایہ تھے جو کبھی ان کے ہمسائے میں رہتے تھے اور جو ان سے بات تک کرنے کے روادار نہیں ہوتے تھے۔

چہرے پر جھریوں کا جال لیے زرد رنگت' کمر میں خم کے ساتھ جو ضعیف آدمی ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ پہلی نظر میں انہیں پہچان نہیں پائے تھے۔ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ کیا رویہ رکھیں۔ آخر اب کیا شے تھی جو انہیں کھینچ کر یہاں لائی تھی۔

"مجھے امامہ سے بات کرنی اور ملنا ہے۔" چند ہی جملوں کے بعد ہاشم مبین نے ان سے کہا تھا۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔" سکندر عثمان نے بڑے محتاط انداز میں انہیں بتایا۔

"میں جانتا ہوں۔ وہ کانگو میں ہے... میں وہاں کا نمبر لینا چاہتا ہوں۔ وہاں کے حالات خراب ہیں... وہ ٹھیک ہے؟"

انہوں نے رک رک کر۔ لیکن ایک ہی سانس میں ساری باتیں کی تھیں۔ سکندر کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ کیا کہیں۔

"ہاں... وہ' سالار اور بچے ٹھیک ہیں۔"

اگر وہ تشویش میں یہاں آئے تھے تو سکندر عثمان نے ان کی وہ تشویش دور کر دی تھی۔ وہ فون نمبر کا مطالبہ گول کر گئے تھے۔

"میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں' ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" ہاشم مبین اپنا مطالبہ نہیں بھولے تھے۔

"میں امامہ سے پوچھے بغیر اس کا نمبر یا ایڈریس آپ کو نہیں دے سکتا۔" سکندر عثمان نے کوئی تمہید نہیں باندھی تھی۔

"میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اب۔" انہوں نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"آپ اسے بہت زیادہ نقصان پہلے ہی پہنچا چکے ہیں۔" سکندر عثمان نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "وہ اب اپنی زندگی

میں سیٹ ہے۔۔۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ بہت خوش' بے حد مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ آپ کیوں ایک بار پھر اس کو ڈسٹرب کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ آپ کی بیٹی نے پہلے ہی آپ کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ آپ اب اسے چھوڑ دیں۔ اسے بخش دیں۔"

ہاشم مبین کے چہرے کی جھریاں یک دم بڑھی تھیں' پھر انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔

"میں جانتا ہوں' مجھے احساس ہے۔"

سکندر عثمان بول نہیں سکے' وہ ان کے منہ سے یہ جملے سننے کی توقع نہیں کر رہے تھے۔

"بس ایک آخری بار ملنا چاہتا ہوں اس سے۔۔۔ اس کی ایک امانت ہے' وہ دینی ہے مجھے۔۔۔ اور اس سے معافی مانگنی ہے۔"

"آپ مجھے اپنا فون نمبر اور ایڈریس دے دیں' میں اس سے بات کروں گا' پھر آپ سے رابطہ کروں گا۔۔۔ آپ کہاں رہتے ہیں اب۔" سکندر نے اس سے پوچھا۔

"اولڈ ہوم میں۔۔۔" سکندر چپ کے چپ رہ گئے۔ ہاشم مبین اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"امامہ کو بتا دیں۔۔۔ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔۔۔ پھر وہ مجھ سے ضرور بات کرے گی۔"

اپنی نشست سے کھڑے ہوتے ہوئے سکندر عثمان ان کے اگلے جملے پر دم بخود رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

جیمی بے اختیار ہنسی۔۔۔ جواب غیر متوقع نہیں تھا۔۔۔ کوئی مرد اس کی کشش کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ مگر اس نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی مرد نہیں دیکھا تھا جس نے اس کی اتنی کھلی دعوت کو رد کیا ہو۔

وہ نیویارک کی مہنگی ترین Escorts میں سے ایک تھی اور مہنگی ترین کا لفظ اس کے لیے بہت چھوٹا پڑ جاتا تھا۔۔۔ اس کی خدمات حاصل کرنے والے دنیا کی مشہور ترین کمپنیز کے سربراہان شامل تھے۔۔۔ کیونکہ جیمی کی خدمات ہر کوئی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے "کلائنٹس" محدود تھے اور Forbes کے 100 امیر ترین لوگوں کی فہرست میں شامل تھے۔ وہ ان کلائنٹس کے علاوہ صرف چند لوگوں کے لیے کام کرتی تھی اور آج اسے ایک نوجوان کے سامنے بیٹھے ہوئے اس ایک شخص کے ساتھ رات گزارنے کے لیے پیسے دیے گئے تھے جو اس وقت مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنے گلاس میں موجود اورنج جوس کا آخری گھونٹ لے رہا تھا۔

"اوہ۔۔۔ واؤ۔۔۔ گریٹ۔" جیمی نے شیمپین کا ایک اور گھونٹ بھرتے ہوئے قاتلانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے۔۔۔

"لیکن صرف حوروں کے ساتھ۔" اس شخص کا اگلا جملہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ اب اپنے ہاتھ کی پشت پر سر گرائے اس کا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔

"کون۔۔۔ وہ کون ہے؟" جیمی سمجھ نہیں سکی' لیکن اسے یک دم اس "حور" کو جاننے میں دلچسپی نہیں ہوئی جس کا ذکر وہ مرد کر رہا تھا جو 37 سال کی عمر میں ورلڈ بینک کی تاریخ کا سب سے کم عمر ترین وائس پریذیڈنٹ تھا اور جو اپنی ورلڈ بینک کے چند افراد کے ساتھ موجود تھا جو اس وقت بار کے قریب ڈانس فلور پر تھرک رہے تھے۔۔۔ یہ "بلکہ" تھرک رہے تھے۔

سالار سکندر نے اپنے والٹ سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی پشت پر ایک پین سے کچھ لکھا اور میز پر انگلیوں سے تھپ تھپاتے دبائے اسے جیمی کی طرف کر دیا۔ جیمی نے وزیٹنگ کارڈ کی پشت پر عربی میں لکھا ایک جملہ

دیکھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے سالار سے کہا۔

"یہ کیا ہے۔۔۔؟ میں اسے پڑھ اور سمجھ نہیں سکتی۔" اس نے کندھے اچکا کر سالار کو دیکھا جواب اپنے گلاس کے نیچے کچھ نوٹ دباتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے تمہارے ڈرنکس کی ادائی کردی ہے۔"

جیکی نے انگلی اور انگوٹھے میں دبے اس کارڈ کو سالار کو دکھایا اور دوبارہ کہا۔ "میں یہ پڑھ اور سمجھ نہیں سکتی۔"

"جنہوں نے آپ کو بھیجا ہے' وہ پڑھ بھی لیں گے' سمجھ بھی لیں گے' سمجھا بھی دیں گے۔"

جیکی کو اس کے جملے پر کرنٹ لگا۔ اس کی قاتلانہ مسکراہٹ سب سے پہلے غائب ہوئی تھی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔" (معاف کیجئے) اس نے ایک بار پھر اپنی لاعلمی اور بے خبری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"Excused" (معاف کیا) وہ مسکراتے اور کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے اس ہوٹل کے ایک کمرے کو کنڈکٹ کرتے اور خفیہ کیمرے اور مائیکروفون کی مدد سے گفتگو سنتے ان پانچ لوگوں کو ایک لمحہ کے لیے پسینہ آیا تھا۔ ان پانچ کے پانچ نے ایک وقت میں ایک دوسرے کو بے اختیار دیکھا' پھر ان سب نے بے اختیار اس شخص کو گالی دی تھی۔۔۔ وہ اس شخص کو پیش کیا جانے والا ان کا بہترین تحفہ تھا۔۔۔ وہ اس پھندے سے بچ کر نکلنے والے مردوں میں پہلا تھا۔

"اس کارڈ پر کیا لکھا ہے؟" سی آئی اے کی اسٹنگ ٹیم کے لیڈر نے آدھ گھنٹے بعد جیکی کے اس کمرے میں آنے سے پہلے وہاں بلوائے عربی مترجم سے پوچھا تھا۔

"اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔" اس مترجم نے وہ تحریر پڑھی۔

"مطلب۔۔۔"

"میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔" مترجم نے اس بار روانی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔

ان سب لوگوں نے جیکی اور جیکی نے انہیں دیکھا' پھر قاتلانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"I am sure he wasn't referring to me"

(مجھے یقین ہے کہ یہ میرے بارے میں نہیں ہے۔)

☆ ☆ ☆

آپریشن کے دوران وہ نیورو سرجن چند لمحوں کے لیے رکا تھا۔ ایک نرس نے بائیں اس کے ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کے چند قطروں کو ایک کپڑے سے خشک کیا۔ وہ شخص ایک بار پھر اپنے سامنے آپریشن تھیٹر کی ٹیبل پر لیٹے ہوئے اس دماغ پر جھکا جو دنیا کے ذہین ترین دماغوں میں سے ایک تھا اور جو ایک گولی کا نشانہ بننے کے بعد اس کے سامنے اس میز پر پڑا تھا۔ دنیا کی اہم ترین پوزیشنز پر فائز رہنے والے اس شخص کے لیے اسے ایمرجنسی میں بلوایا گیا تھا۔ وہ نیورو سرجن اب تک (27) اہم اور نازک ترین کامیاب سرجریز کرنے کے بعد اس وقت امریکہ کی نمبر ون اور سب سے قابل سرجن تھا۔ لیکن آج پہلی بار اسے لگ رہا تھا کہ اس کا ہنڈرڈ پرسنٹ کامیابی کا ریکارڈ ٹوٹنے والا تھا۔ وہ ایک بار پھر گہرا سانس لے کر ٹیبل سے ہٹا۔ اسے کسی چیز کی ضرورت پڑی تھی اس آپریشن میں کامیاب ہونے کے لیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)